

قرآن کا تصویریں



پروفیسر ڈاکٹر فاروق عزیز

۱۷۵۲۱۲

قرآن کا تصویرِ نفس

ڈاکٹر فاروق عزیز

ناشر

اسلامک بک سینٹر

نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

2736870-0321-2085624

67, 41, 49

88

۲۹۷۳۱۷

109

۱۹

122

۷۲۷۲۷

جملہ حقوق بہ حق مصنف محفوظ ہیں

قرآن کا تصورِ نفس

کتاب کا نام

ڈاکٹر فاروق عزیز

مصنف

۲۰۰۶ء

سن اشاعت

کمال کمپیوٹرز اینڈ کوچنگ انسٹیٹیوٹ

کمپوزر

اسلامک بک سینٹر، اردو بازار کراچی

ناشر

180/- روپے

قیمت

لسان اولیٰ نفس در مختلف صبریں 37, 38, 39

کجی لسان - 44, 45

سالی نفسی با عقول نفسی انوارین 74

لسان اولیٰ نفسی با ذمہ دار - 76

لسان اولیٰ نفسی با حفاظت بدعتیں - 79

لسان اولیٰ ذریعہ آزمائش - 81

لسان اولیٰ نفسی با استعداد سے زیادہ موقوف 93

شب علیٰ نفسی الرحمہ - 126 - اللہ بالنفس

تخلیق ارض و سما - نفسی لسانی - 132

صالحی نفسی کے لیے عقیدہ اور کمال کمالی نفسی کے لیے عقیدہ اور

129 - 31

14 / 151 / 169

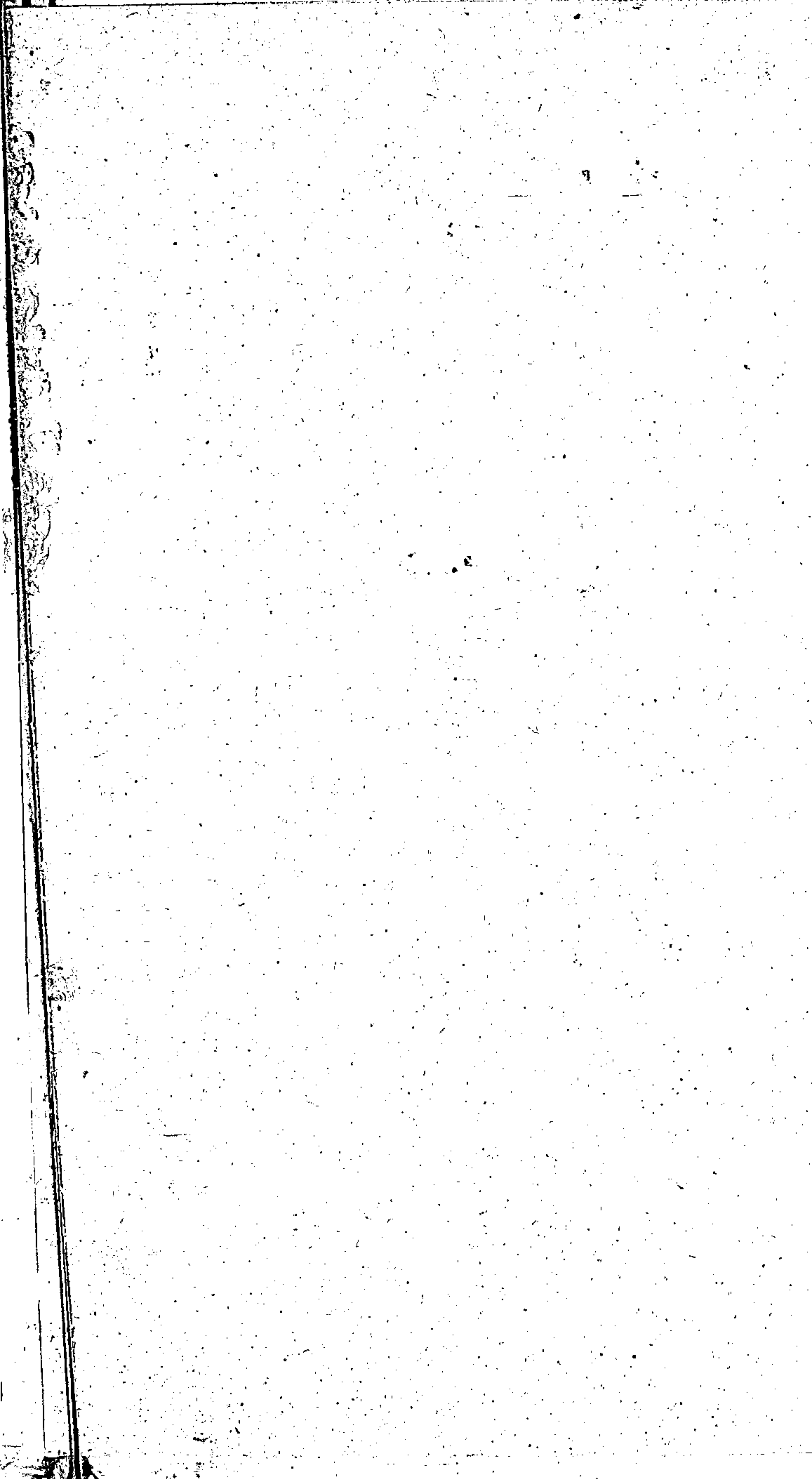
نفسی لسانی اور نفسی لسانی

232

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ
يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ
عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝

ہم عنقریب ان کو آفاق میں اور خود ان کے اپنے نفوس میں
اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا
کہ یہ (قرآن) حق ہے کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ
تمہارا رب ہر شے پر نگران ہے۔ (۴۱/۵۳)

میں نے
اپنی



حرفِ آغاز

ایسے سوالات جو ہمیشہ سے انسانی تجسس کو دعوت مہمیز دیتے آئے ہیں ان میں سے ایک سوال خود انسانی شخصیت کی نوعیت و ماہیت کا بھی ہے یعنی خود انسان کیا ہے؟ یہ سوال فلسفہ اور تصوف کے چند پسندیدہ سوالات میں ہمیشہ سے شامل رہا ہے۔ ہر عہد کے فلسفی اور صوفی اس حوالے سے اپنی رائے اور تجربات بیان کرتے آئے ہیں تاہم خالصتاً سائنسی انداز میں اس حوالے سے کام گذشتہ صدی سے شروع ہوا جب علم النفسیات کو باقاعدہ علم کی ایک علیحدہ شاخ تسلیم کرتے ہوئے نفس انسانی یا انسانی شخصیت پر تحقیقات کا آغاز ہوا۔ جدید علم النفسیات کی نظر چونکہ صرف اس دنیا اور اس دنیا میں انسانی شخصیت پر اثر انداز ہونے والے اسباب و عوامل تک محدود ہے لہذا وہ جب انسانی شخصیت کا تجزیہ کرتی ہے تو انہی علتوں (Causes) تک محدود رہتی ہے جو ہماری روزمرہ زندگی میں سامنے آتے ہیں اور وہ انہی سے انسانی شخصیت کا تانا بانا بنتی ہے لیکن وہ چونکہ حیات بعد الموت کے تصور سے بے بہرہ ہے لہذا تصویر کا ایک رخ تو سامنے لاتی ہے پوری تصویر کی عکاسی نہیں کر پاتی۔ حیاتِ اخروی تسلیم کرنے کا لامحالہ مطلب اللہ کو تسلیم کرنا ہے جس کی جدید علوم کی ”روشن خیالی“ متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے انسانی شخصیت پر صرف دنیاوی پس منظر میں بحث کی جاتی ہے اور اس حوالے سے جہاں بھی ”خدائی مداخلت“ کا اندیشہ ہو اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس قرآن کا انسانوں سے سب سے پہلا اور بنیادی مطالبہ ہی اللہ اور حیات بعد الموت پر ایمان کا ہے۔ اس تناظر میں حیاتِ صرف اس دنیا تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کا

بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ قرآن اسی تناظر میں انسانی شخصیت کے حوالے سے گفتگو ہے۔ دوسری طرف انسان اور انسانی شخصیت از روئے قرآن کوئی نظری معاملہ نہیں ہے۔ اس پر انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگیوں کا انحصار ہے ایسی زندگی جو نیا سے لیکر روزِ قیامت کے بعد تک کی زندگی پر محیط ہے۔ لہذا اس بابت قرآن کی بڑی مکمل اور جامع ہے جس پر اس کتاب میں مرحلہ وار روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی

انسانی شخصیت کے لیے نفس کی اصطلاح استعمال کرتا ہے اور اُم الکتاب کی رو سے شخصیت دو اجزاء سے عبارت ہے اول انسانی شعور اور دوم وہ نفس جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر انسان کو پیدائش کے وقت قطعی متوازن حالت میں عطا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے لیے نفس کی اصطلاح استعمال کرتا ہے تاہم سیاق و سباق سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کس حوالے سے یا کس تناظر میں بات کر رہا ہے جہاں تک اول الذکر نفس یعنی شعور کا تعلق ہے اس کی دو سطحیں ہوتی ہیں اول حیوانی سطح اور دوم انسانی سطح۔ حیوانی نفس کا مطمح نظر محض جسمانی تقاضوں کی تکمیل اور حصول لذت ہوتا ہے یہ سطح نفس امارہ ہے۔ اس سے بلند سطح انسانی سطح ہے جہاں انسان اپنی جسمانی ضروریات کی تکمیل کے علاوہ اعلیٰ مقاصد کے حصول کی جدوجہد کرتا ہے۔ جہاں تک انسانی شخصیت کے دوسرے تعلق ہے جسے نفس انسانی کہا جاتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہر انسان کو متوازن طور پر عطا ہوتا ہے اور ہر انسان صرف اور صرف اپنے نفس کا مکلف ہوتا ہے۔ انسانی مقصد اس نفسی توازن کو برقرار رکھنا اور مستحکم کرنا ہے اور از روئے قرآن روزِ قیامت

انسان کی کامیابی یا ناکامیابی کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ انسان اس توازن کو کس حد تک برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے ایسے لوگ جو یہ توازن برقرار رکھنے میں کامیاب ہوں گے وہ جنتی اور جنہوں نے اس کو قرآنی اصطلاح میں خاک میں ملا دیا وہ خسارے میں رہ جائے والے ہوں گے۔ صرف یہی حقیقت اس تصورِ نفس کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

از روئے قرآن تمام تر انسانی افعال کا اثر اس کے نفس پر ہوتا ہے اعمالِ صالح سے نفس توازن مستحکم جبکہ ظلم سے اس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ یوں تمام انسانی افعال نفس پر برا راست اثر انداز ہوتے ہیں لیکن چند مخصوص اعمالِ صالح اور اعمالِ بد ایسے ہیں جن کا قرآن مجید میں خصوصی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان افعال پر الگ سے بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح افعالِ بد یا ظلم کے نتیجے میں نفس کے توازن کی خرابی ایک خاص حد تک اگر نہ پہنچی ہو تو بازیابی کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ ایسے طریقے جن کے ذریعے یہ باز آفرینی ممکن ہے قرآن مجید میں ان کی باقاعدہ صراحت موجود ہے ان کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے تاکہ ایسے نفوس جو اگر راہ ہدایت پر واپس آنا چاہیں تو قرآن میں بیان کردہ طریقے کے تحت واپس آسکیں۔

یہ نتائج قرآن مجید کی صرف ایک دو یا چند آیات سے اخذ نہیں کیئے گئے ہیں۔ اس حوالے سے قرآن مجید کی ان تمام آیات کو مجموعی طور پر زیر بحث لایا گیا ہے جہاں نفس کے حوالے سے واسطہ یا بالواسطہ مباحث ہیں یا جہاں جہاں بھی اس حوالے سے اشارات موجود ہیں۔

قرآن میں نفس انسانی کے متعلق بیان کردہ حقائق کو سمجھنے کے حوالے سے یہ ایک ادنیٰ سی کاوش ہے جو کسی طرح بھی سہو و خطا سے منزہ نہیں ہو سکتی اور ظاہر ہے تمام تر سہو و خطا کے

ری بھی مجھ پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اور اس سہو و خطا کے لیے میں اپنے رب سے
 عفو ہوں وہ یقیناً بہت درگزر کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ یہ کوشش ان
 م کے حامل لوگوں کے لیے ہے جو یہ نہیں دیکھتے کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھتے ہیں
 جا رہا ہے۔

گر قبول افتخار و شرف

ڈاکٹر فاروق عزیز

نگراں شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن

وفاقی اردو یونیورسٹی

گلشن اقبال کیمپس کراچی

فہرست

۱۵

باب اول: انسانی شخصیت

شخصیت کی تعریف، شخصیت کے تشکیلی عوامل، شخصیت کی خصوصیات، شخصیت کے اہم نظریات، فرائیڈمین کا نظریہ، شخصیت، یونگ کا نظریہ، ایڈلر کا شخصیت کا نظریہ۔

باب دوم: قرآن کا تصورِ نفس

۳۳

نفس، از روئے قرآن انسانی شخصیت دو (۲) اجزاء پر مشتمل ہے، انسانی شخصیت کا جزو اول: انسانی شعور، نفس کی اصطلاح بمعنی شعور، نفس کی اصطلاح بمعنی انسانی شخصیت (بہ حیثیت مجموعی)، نفس (شعور انسانی) اور اس کی سطحیں، نفس اور جسم کا تعلق، انسانی شخصیت کا جزو دوم نفس انسانی / نفس، نفس انسان کے اپنے اختیار سے حاصل کردہ امانت ہے، انسان اپنے نفس پر مکمل قدرت رکھتا ہے، انسان کو نفس متوازن حالت میں عطا ہوتا ہے، انسانی زندگی کا مقصد نفس کے توازن کو برقرار رکھنا ہے، انسان صرف اپنے نفس کا ذمے دار ہے، اہل ایمان کو نفس کی حفاظت کا حکم، نفس انسانی ذریعہ آزمائش، آزمائش کا مقصد، کسی نفس (انسان) کو اس کی وسعت سے

زیادہ کامیاب نہیں کیا جاتا، نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ، مستقل اخلاقی اقدار کا سرچشمہ صرف قرآن مجید ہے، عملی جانچ، نفس لوامہ اصل فریضہ نہیں بھولتا، ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ، ایک سطحی تضاد اور اس کا حل، نفس مطمئنہ، انسانی موت و حیات انسانی شخصیت کے دونوں اجزاء کی علیحدگی اور ملاپ کا نام ہے، موت کے وقت فرشتہ اجل انسانی شخصیت کے دونوں اجزاء پر قبضہ کر لیتا ہے، ہر ایک نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، کوئی نفس اللہ کے اذن کے بغیر مر نہیں سکتا، اللہ ہر نفس پر نگران ہے، نفس انسانی میں اللہ کی آیات، اللہ انسانی نفس کو بخوبی جانتا ہے، نفس کی اصطلاح اللہ کی ذات کے حوالے سے۔

باب سوم: انسانی افعال اور نفس

۱۲۷

انسانی سعی کا محور اس کا اپنا نفس ہوتا ہے، اعمال صالحہ نفس کے لئے منفعت بخش اور اعمال بد نفس کے لئے ضرر رساں ہوتے ہیں اعمال صالح، اعمال بد، اللہ کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتا، علت تخلیق ارض و سماء، اعمال کے نتائج مستقبل میں مرتب ہوتے ہیں، روز قیامت ہر نفس کو پورا پورا بدلہ ملے گا۔

باب چہارم: نفس انسانی کو ضعف پہنچانے والے عوامل

۱۲۸

اگر اللہ چاہتا تو تمام نفوس کو ہدایت دے دیتا، تمام نفوس کو ہدایت کیوں نہیں دی گئی؟ تمام تکالیف نفس کی بدی کی وجہ سے آتی ہیں، نفس پر

آنے والی مصیبت طے شدہ قانون کے مطابق آتی ہے، وہ افعال جو نفس کو ضرر پہنچاتے ہیں، تقلید یا اسلاف پرستی، دنیاوی زندگی کی ہوس، بخل سے نفس کی تباہی، استطاعت ہوتے ہوئے بھی ہجرت نہ کرنا، نفس پر ظلم ہے، اللہ کی حدود سے نکل جانا نفس کے لیے تباہی ہے، نفس کی خیانت، نفس کی ہلاکت: وہ افعال جو نفس کی ہلاکت پر منتج ہوتے ہیں، دوسروں کا مال باطل طریقوں سے کھانے سے نفس کی ہلاکت، قرآن سے دور رہنا اور دوسروں کو قرآن سے روکنا نفس کی ہلاکت ہے، جہاد سے فرار کے لئے جیلہ سازی نفس کی موت ہے، ہلاکت نفس کی اصطلاح، اصلاح کے معنوں میں، آنحضرت ﷺ کے خصوصی حوالے سے۔

باب پنجم: شیطان اور نفسِ امارہ کا باہمی تعلق

شیطان، نفسِ امارہ کا منفی کردار، نفسِ امارہ کے وہ طریقے جن کی مدد سے وہ انسانوں کو راہِ ہدایت سے بھٹکاتا ہے، بری باتوں کا حکم دینا، اعمالِ بد کو خوبصورت کر کے دکھانا، نفس خود غرضی کی جانب راغب کرتا ہے، وسوسے پیدا کرنا، نفس (امارہ) عدل سے ہٹا دیتا ہے، نفس (امارہ) اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی پر اکساتا ہے، نفس (امارہ) دنیا کا طالب ہوتا ہے۔

باب ششم: نفس کا احیاء اور نفس کے لئے منفعت بخش اعمال

نفس کا احیاء، استغفار سے بحالی نفس، وہ افعال جو نفس کے لئے

منفعت بخش ہیں: انفاقِ نفس کے لئے بہتر ہے، ہدایت سے نفس کو فائدہ ہوتا ہے، شکر سے نفس کو فائدہ پہنچتا ہے، پاکیزگی اختیار کرنا، اقوام کے نفس اجتماعی کی حیات و موت۔

انسانی شخصیت

انسان اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ لاتعداد مخلوقات میں سے ایک ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی اکثر مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا

(۱۷/۷۰)

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ رزق عطا کیا اور اپنی کئی مخلوقات پر فضیلت دی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تخلیق کو جن اوصاف سے نوازا ہے ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ انسانی شخصیت بنیادی طور پر انہی اوصاف کے مجموعے کا نام ہے۔ چونکہ یہ اوصاف ہزاروں کی تعداد میں ہیں لہذا یہ بدیہی طور پر ناممکن ہے کہ ان منجملہ تمام اوصاف کو کسی واحد تعریف میں سمو کر شخصیت کی کوئی جامع تعریف پیش کی جاسکے۔

شخصیت کی تعریف:

مختلف ماہرین نفسیات نے شخصیت کی جو تعریفیں پیش کی ہیں ان کی تعداد بھی سینکڑوں تک جا پہنچی ہے اور ظاہر ہے ان میں سے کسی بھی تعریف کو جامع قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم آغاز بحث کی خاطر اور شخصیت کا ایک ابتدائی خاکہ مرتب کرنے کے لیے چند بالعموم قبول کی جانے والی تعریفیں ذیل میں دی گئی ہیں۔

فطری میلانات اور وراثتی صفات کی مکمل تنظیم شخصیت کہلاتی ہے۔ (منیک ڈوگل)
 شخصیت ہمارے اس کردار کا مجموعہ ہے جنکے ذریعے ہم زندگی کا آغاز کرتے ہیں اور
 کے توسط سے ہم زندہ رہتے ہیں۔ (وائسن)

شخصیت انسان کی ایک طبعی تصویر ہے جس میں فرد کے تمام پہلوؤں نے مل کر کام
 ہے۔ (سائمنڈ)

شخصیت فرد کے ان نفسیاتی طور طریقوں کی تنظیم ہے جو اس کو ماحول میں نمایاں
 وقت دیتے ہیں۔ (اپورٹ)

فرد کے سوچنے، محسوس کرنے اور عمل کرنے کے مخصوص انداز کو اس کی شخصیت کہا
 ہے۔ (مائرز)

ترقیات کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شخصیت فرد کی تمام وراثتی اور اکتسابی صلاحیتوں کا
 مجموعہ فرد کی ذاتی کوششوں، وراثتی اثرات اور اس ماحول کے اثرات سے
 بنتا ہے جس میں وہ فرد پرورش پاتا ہے۔ شخصیت بنیادی طور پر ان اوصاف اور
 صفات کے مجموعے کا نام ہے جو ایک فرد کو کسی دوسرے فرد سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ
 اوصاف اچھے اور برے دونوں ہو سکتے ہیں اپنے اچھے اوصاف سے ایک شخصیت پسندیدہ
 اور برے اوصاف سے ناپسندیدہ قرار پاتی ہے۔

شخصیت کے تشکیلی عوامل:

ملاحظہ فرمائیں کہ عرض کیا گیا کہ شخصیت فرد کی مختلف النوع صلاحیتوں اور اوصاف کا مجموعہ ہوتی
 ہے۔ تاہم اس کی تشکیل میں لاتعداد عوامل حصہ لیتے ہیں۔ ان عوامل کو چار بنیادی عوامل میں

تقسیم کیا جاتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ طبعی عوامل

طبعی عوامل سے مراد انسانی شخصیت کی طبعی خصوصیات ہیں جس میں والدین اور آباؤ اجداد کے وراثتی اثرات شامل ہوتے ہیں۔ یہ عامل انسانی شخصیت کے جمالی پہلو کی تشکیل کرتا ہے۔ اس میں انسان کا چہرہ، جسمانی خدو خال غرضیکہ پوری جسمانی ہیئت شامل ہے۔ ایک اچھے طبعی اوصاف رکھنے والی شخصیت نامناسب طبعی اوصاف رکھنے والی شخصیت کی بہ نسبت زیادہ پسند کی جاتی ہے۔

۲۔ ذہنی عوامل

ذہنی عوامل سے مراد انسان کی ذہنی صلاحیتیں، افکار و خیالات اور تخلیقی صلاحیتیں ہیں۔ ان کا شخصیت کی تشکیل میں ایک نمایاں کردار ہوتا ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ ان صلاحیتوں کا حامل ہوگا اتنا ہی معاشرتی لحاظ سے قابل قدر ہوگا اور برعکس صورت میں صورت حال برعکس ہو جائے گی۔

۳۔ جذباتی عوامل

انسانی جذبات، انسانی شخصیت کی تکمیل میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں انہیں شخصیت کے بنیادی محرک کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اچھے اور صحت مند جذبات جن میں کام کی لگن آگے بڑھنے کا جذبہ، محنت کی خواہش، محبت، ایثار، لگن، زندہ دلی، خوش اخلاقی، ہمدردی اور رواداری وغیرہ ایسے جذبات ہیں جو شخصیت کو ایک تعمیری رخ دیتے ہیں جبکہ منفی جذبات جن میں بغض و عناد، بے مروتی، مایوسی اور ناامیدی، جارحیت، بخیلی، ہوس اور دشمنی وغیرہ ایسے جذبات ہیں جو انسانی شخصیت کو منفی طور پر متاثر کرتے ہیں۔ سب سے بہتر اعتدال

یعنی ایسی شخصیت جو موقع محل کے اعتبار سے مناسب جذباتی رد عمل کا اظہار کرے
میں افراط و تفریط سے کام نہ لے۔

معاشرتی عوامل

ان عوامل میں وہ خارجی اور معاشرتی محرکات شامل ہیں جو فرد کی شخصیت پر اثر انداز
ہیں۔ ان عوامل میں گھر کا ماحول، خاندانی ماحول، دوست احباب، تعلیمی ادارے اور
عورت وغیرہ شامل ہیں۔ یہ عوامل کسی بھی شخصیت پر ایک گہری چھاپ رکھتے ہیں اور
شخصیت کی تکمیل میں مختلف حوالوں سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

شخصیت کی خصوصیات:

شخصیت کئی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے جن میں سے محض چند بنیادی خصوصیات کا
درج ذیل ہے۔

وحدت

شخصیت بنیادی طور پر ایک وحدت ہے جو بیک وقت مماثل اور متضاد صفات سے
ساتھی ہے۔ یہ وحدت ایک مخصوص کردار تشکیل دیتی ہے۔ ایک فرد زندگی اور اس
کے معاملات کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نکتہء نگاہ رکھتا ہے اور مختلف حالات و
میں ایک مخصوص طرز عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس طرح ایک مخصوص فکر اور طرز عمل
شخصیت وجود میں آتی ہے جو ایک الگ وحدت کی حامل ہوتی ہے۔

حرکت

کی دوسری نمایاں خصوصیات اس کی حرکت پذیری ہے۔ انسانی شخصیت پیدائش
تک کسی نہ کسی حوالے سے متحرک رہتی ہے۔ اس حرکت پذیری کی شدت کم و بیش

ہو سکتی ہے۔ انسانی جذبات، خیالات، دلچسپیاں، اقدار، عادات اور محرکات وغیرہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف النوع آنے والی تبدیلیاں جن میں سماجی، معاشرتی اور معاشی تبدیلیاں شامل ہیں انسانی شخصیت پر اثر انداز ہو کر اسے تبدیل کرتی رہتی ہیں یا کم از کم تبدیلی کا محرک ضرور بن جاتی ہیں۔ اس طرح انسانی شخصیت مسلسل تبدیلیوں کی زد میں رہتی ہے۔

۳۔ تسلسل

اگرچہ ہمارے ارد گرد مختلف النوع تبدیلیوں کا ایک مسلسل عمل جاری ہے اور یہ عمل خاصا ہمہ گیر بھی ہے تاہم اس ہمہ گیر تبدیلی کے عمل میں بھی انسانی شخصیت کا تسلسل ٹوٹا نہیں ہے۔ شخصیت کی جو بنیاد ابتدائی عمر تا جوانی میں رکھ دی جاتی ہے اس میں جزوی اور مختلف النوع تبدیلیوں کا عمل بھی یقیناً جاری رہتا ہے تاہم یہ تبدیلیاں شخصیت کا بنیادی ڈھانچہ تبدیل نہیں کرتیں۔ انسانی شخصیت کے بنیادی خدو خال بدستور رہتے ہیں۔ زندگی میں کئی مختلف قسم کے موڑ، پیچ و خم اور اتار چڑھاؤ آتے ہیں ان سے کوئی مفر نہیں لیکن ان تمام عوامل کے باوجود شخصیت کا جوہر تبدیل نہیں ہوتا۔ اس کی مثال دریا سے دی جاسکتی ہے جو کئی مختلف علاقوں سے گزرتا ہے ان میں پہاڑ، سطح مرتفع اور میدانی علاقے وغیرہ شامل ہوتے ہیں لیکن دریا کا بہاؤ قائم رہتا ہے۔

۴۔ پیش گوئی

یہ خصوصیت تیسری خصوصیت سے ہی متصف ہے جب یہ امر طے شدہ ہے کہ انسانی شخصیت ایک مسلسل تسلسل برقرار رکھتی ہے تو اس بنیاد پر کسی مخصوص انسانی شخصیت کے طرز عمل کے

یے کے بعد یہ کہنا بڑی حد تک ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ مخصوص شخصیت چونکہ اس مخصوص طرز عمل کی مالک ہے لہذا وہ آئندہ بھی اس قسم کے مواقع پر اسی طرز عمل کا مظاہرہ کرے گی جو وہ کرتی آئی ہے۔ اگرچہ یہ بہر حال کوئی کلیہ نہیں ہے انسانی طرز عمل کوئی مشین نہیں جس کے متعلق شرح صدر سے کہا جاسکے کہ وہ ہمیشہ ایک جیسے حالات میں ایک ہی قسم طرز عمل کا مظاہرہ کرے گی۔ متشذبات کی گنجائش یہاں بہر حال ممکن ہوتی ہے تاہم ایک دو حد تک اس سے زائد نہیں۔

انفرادیت اور یکسانیت

صیت اپنی ایک انفرادیت اور یکسانیت رکھتی ہے۔ اسے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ ہر شخص اپنی چند خصوصیات میں دیگر افراد کی طرح ہوتا ہے لیکن ان میں سے کسی کے جیسا نہیں۔ وراثتی اور ماحولیاتی اثرات ہر شخص دیگر افراد کی طرح یکساں انداز میں قبول کرتا ہے۔ اس کی انفرادیت اور یکسانیت اس حوالے سے ہوتی کہ وہ جن تجربات سے گذرتا ہے وہ متماً اسی کے اپنے ہوتے ہیں کوئی بھی دیگر شخص بعینہ انہی جیسے تجربات سے نہیں گذر سکتا۔ اس کی اپنی مخصوص محبتوں، دشمنیوں، غموں اور نفرتوں کا حامل ہوتا ہے جو خالصتاً اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک ہی والدین کی اولاد جو ایک ہی ماحول میں پرورش پائی ہو یا ایک ہی سے متعلق افراد بھی اپنی انفرادیت نہیں کھوتے یہ انفرادیت شخصیت کا مخصوص خاکہ ہے۔

وراثت اور ماحول

ت اور ماحول دو الگ الگ عوامل ہیں جو شخصیت کی نمایاں خصوصیات میں شامل ہیں۔ شخصیت کو وراثت میں ملنے والے خصوصیات صرف وہی نہیں ہوتیں جو والدین سے ملتی

ہیں بلکہ یہ پیچھے ہمارے آباؤ اجداد تک چلتی ہیں بلکہ اس کی جڑیں انسانی ارتقاء میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ وراثت میں ملنے والی خصوصیات ماحول کے زیر اثر ہوتی ہیں موافق ماحول ملنے کی صورت میں یہ خصوصیات مزید چلا پاتی ہیں اور غیر موافق ماحول کی صورت میں ان کی نشوونما منفی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ وراثت میں ملنے والی جسمانی صفات کا اندازہ ہو سکتا ہے تاہم ذہنی اور اخلاقی صفات کی بابت اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور نہ ہی اس حوالے سے کوئی پیشگوئی کی جاسکتی ہے۔ اخلاقی صفات بنیادی طور پر تربیت، ماحول، تعلیم، سماجی اثرات اور خاندانی اثرات سے ترتیب پاتی ہیں۔

جہاں تک ماحول کا تعلق ہے اس کا آغاز بنیادی طور پر استقرارِ حمل سے ہی شروع ہوتا ہے۔ رحمِ مادر میں جنین کی نشوونما ماں کی ذہنی اور جسمانی حالت بچے پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ پیدائش کے بعد وہ ماحول جس میں بچہ آنکھ کھولتا ہے، تربیت پاتا ہے، اس حوالے سے گھر کا ماحول، ماں باپ کے آپس کے تعلقات، دیگر بہن بھائیوں، رشتے داروں، دوست احباب سے تعلقات، ان کا برتاؤ، پھر تعلیمی ماحول، اساتذہ کا رویہ اور اسی طرح سے لاتعداد عوامل ہوتے ہیں جو کسی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ تمام عوامل ایک بے انتہا پیچیدہ عمل اور رد عمل کا سلسلہ ترتیب دیتے ہیں جو انسانی شخصیت پر براہِ راست یا بالواسطہ اثر انداز ہوتا ہے۔

شخصیت کے اہم نظریات:

علم النفسیات میں شخصیت پر بہت کام ہوا ہے اور اس ضمن میں شخصیت کے حوالے سے کئی نظریات پیش کیے گئے ہیں جن میں شخصیت کے اوصاف کے نظریات، شخصیت کے حرکی

یات، شخصیت کے وقتی نظریات، شخصیت کے سماجی و قومی نظریات اور شخصیت کا نظریہ وغیرہ شامل ہیں۔

نظر کتاب کا بنیادی مقصد شخصیت کی ساخت اور اس کی نشوونما کے حوالے سے قرآنی بات کو پیش کرنا ہے لہذا اس مقصد کے لیے یہ ضروری ہے کہ قرآنی تعلیمات کو سمجھنے سے عام مروج ایسے نظریات جو شخصیت کی ساخت اور اس کی نشوونما سے متعلق پیش کیے ہیں انکا ایک اجمالی جائزہ لیا جائے تاکہ اس حوالے سے انسانی فکر اور قرآنی تصورات مابین فرق واضح ہو سکے۔

بت کی ساخت اور اس کی نشوونما کے حوالے سے مروج عام نظریات میں سگمنڈ فرائیڈ کا نظریہ متعدد حوالوں سے نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ یونگ اور ایڈلر وغیرہ نظریات بھی اس حوالے سے اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مفکرین کے خیالات کا اجمالی جائزہ جہ ذیل ہے۔

فرائیڈمین کا نظریہء شخصیت

فرائیڈمین کے نظریہء شخصیت کی وضاحت تین حوالوں سے کی جاتی ہے۔

(1) **شخصیت کی ساخت Structure of Personality**

(2) **شخصیت کی نشوونما Development of Personality**

(3) **شخصیات کی حرکیات Dynamics of Personality**

لوں کی مختصر اوضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

الف) شخصیت کی ساخت Structure of Personality

فرائیڈ انسانی شخصیت کو ساخت کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے جو: لا ذات (Id)، انا (Ego) اور فوق الانا (Super Ego) کہلاتے ہیں۔ ان تینوں حصوں کا اجمالی تجزیہ حسب ذیل ہے۔

(۱) لا ذات Id

فرائیڈ کے نزدیک یہ وہ لاشعوری قوت ہے جو تمام انسانی صلاحیتوں، قوتوں اور ضروریات کا ماخذ ہے۔ یہ ایک قطعی اندھی قوت ہے جس کا مقصد ہر قیمت پر اپنی ضروریات اور خواہشات کی تسکین ہے۔ یہی تمام تر جبلتوں، اضطرابی حرکات اور جنسی خواہشات کا سرچشمہ ہے۔ اس قوت کا عقل و شعور سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہ وہ زبردست قوت ہے جو نفسی توانائی کا ذریعہ ہے اور شخصیت کو متحرک و با عمل بناتی ہے۔ اس کے بنیادی فرائض میں تحفظ ذات اور جارحیت کا جذبہ شامل ہے۔ بالفاظ دیگر یہ وہ ذخیرہ ہے جہاں خواہشات جمع ہوتی ہیں اور یہ قوت انہیں ہر قیمت پر پورا کرنا چاہتی ہے چاہے نتائج کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ کسی خاص نصب العین یا تنظیم یا وحدت کے زیر اثر نہیں ہوتی۔ اس کا خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی قوت سے انا اور فوق الانا نشوونما پاتی ہیں۔ چونکہ بنیادی طور پر یہ ایک لاشعوری قوت ہے اور جبلی میلانات کے زیر اثر ہوتی ہے لہذا اس کا تجزیہ بالواسطہ طریقوں مثلاً خواب، کردار، اضطرابی حرکات، روزمرہ کی حماقتوں اور انسانی لغزشوں وغیرہ کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔

(۲) انا Ego

اسے شخصیت کی دوسری منزل کہا جاتا جس میں انسان کی اپنی شناخت یا شخصیت کا تصور پیدا ہوتا ہے اور انسان بہ حیثیت شخصیت اپنی الگ پہچان کرواتا ہے۔ انا، انسانی خواہشات،

وں، افعال اور کیفیات سے ترتیب پاتی ہے جو عقل و شعور کی کیفیات کی حامل ہوتی ہے۔ اس امر کا شعور رکھتی ہے کہ لا ذات کی اندھی قوت کو کس طرح قابو کیا جاسکتا ہے۔ یہ انسانی زندگی ابتدائی منزل ہوتی ہے اور خواہشات کو سماجی اور معاشرتی ضوابط کے تحت پورا کرتی۔ یہ انسانی شخصیت کا وہ حصہ ہوتا ہے جو استدلال سے کام کرتا ہے اور لا ذات اور فوق الانا میں تطبیق پیدا کرتا ہے اور حقیقت پسندانہ نکتہ نگاہ اختیار کرتا ہے۔ یہ لا ذات کی انگلیت اور مزاحمت پیدا کرتی ہے، خارجی دنیا کے حقیقی مطالبات پورا کرتی ہے۔ تجربات کو یاد کر آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرتی ہے۔ یہ حواس کے ذریعے خارجی دنیا سے متاثر ہو کر کٹھی کرتی ہے۔ اس کا کردار بنیادی طور پر شعوری تاہم جزوی طور پر لاشعوری ہوتا ہے۔ لا ذات کے بیرونی دنیا سے رابطے کا کام انجام دیتی ہے، شخصیت کی حفاظت کرتی ہے۔ قی اقدار اور سماجی معیارات کی پاسداری کرتی ہے۔ اس نظام کی کمزوری سے شخصیت راتی علامات پیدا ہونے لگتی ہیں اور وہ تشویش میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

فوق الانا Super Ego

شخصیت کی ساخت کا تیسرا نظام ہے۔ یہ بنیادی طور پر انانیت کو قابو میں رکھتا ہے۔ اس میں نیک و بد کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ یہ انسانی شخصیت کو برے افعال سے اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ عقل و شعور کی انتہائی حد تک سماجی شعور کہا جاسکتا ہے۔ یہ حقیقت سے آگے سے بڑھ کر مثالیت کی جانب متاثر ہے۔ یہ اپنے ارتقاء کے ساتھ ساتھ مثبت جبلتوں کو اجاگر کرتا اور منفی پہلوؤں کو تھمت ڈالتا چلا جاتا ہے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں دو ذیلی نفسی قوتیں پیدا ہوتی ہیں

جنہیں ضمیر (Conscience) اور مثالی انا (Ideal Ego) کہا جاتا ہے۔ اول الذکر کو فوق الانا کا متبادل قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کا ذاتی معیار ہے جس پر فرد خود اپنی دانست میں اچھے اور برے افعال میں فرق کرتا ہے۔ یہ قوت بنیادی طور پر اعلیٰ اخلاقی اقدار مثلاً عدل و انصاف، نیکی، اچھائی اور محبت وغیرہ کو اجاگر کرتی ہے اور منفی افعال و جذبات مثلاً ظلم، نفرت، تعصب اور دشمنی وغیرہ کو پس پشت ڈالتی ہے۔ جہاں تک مثالی انا کا تعلق ہے اس کا تعلق حقیقت پسندی سے کم اور مثالیت یا کمال پسندی سے زیادہ ہوتا ہے یہ اس مقصد کے لئے جدوجہد بھی کرتی ہے اور ایک مثالی معاشرہ کی تکمیل میں سرگرداں رہتی ہے۔

فرائیڈ کے مطابق انسانی شخصیت کے ان تینوں پہلوؤں میں مستقل جنگ جاری رہتی ہے۔ لاذات جو صرف لذت کی خوگر ہوتی ہے حصول لذت کے لئے کبھی انا پر قابو پالیتی ہے اور انسان برے افعال کی جانب راغب ہو کر انہیں انجام دینے لگتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات اس جنگ میں انا کا پلہ لاذات کے مقابلے میں بھاری ہوتا ہے انسان بہت سے ایسے افعال جو فوری لذت فراہم کرتے ہیں انا کے زیر اثر کرنے سے احتراز کرتا ہے اور فوری تسکین کے حصول کے راہ میں خود رکاوٹ بنتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ لاذات کو قابو میں رکھتا ہے۔ بسا اوقات انا اور فوق الانا میں تصادم ہوتا ہے۔ انسان ذاتی نفع کے لیے دوسروں کو ضرر پہنچاتا ہے اور ضمیر کی آواز دبا دیتا ہے۔ تاہم اکثر ضمیر انا کو قابو میں رکھتا ہے اور انسان کو اچھے افعال کی جانب راغب کرتا ہے اور اگر کسی وقت انسان کوئی فعل بد انجام دے بھی لے تو اسے ندامت کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ اپنے آپ کو ملامت کرنا، پچھتاوے کا احساس، دوسروں سے ایسے افعال پر معافی طلب کرنا جس سے انہیں نقصان پہنچا ہو ضمیر کے کام کی مختلف

رتیں ہیں۔

(شخصیت کی نشوونما Development of Personality)

یڈ کے مطابق انسانی شخصیت کی نشوونما میں بنیادی کردار جنسی پہلو کا ہے وہ انسانی
 سیت کی نشوونما کو اسی تناظر میں بیان کرتا ہے۔ اس حوالے سے وہ شخصیت کے پانچ نفسی
 مراحل کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس ضمن میں وہ ایک خاص نفسی توانائی (Libido) کا
 رہ کرتا ہے۔ اس سے مراد فرد کی ایسی نفسی توانائی ہے جس سے فرد کی ایسی خواہشات کی
 مل ہوتی ہے جس سے فرد میں مسرت اور شادمانی کا احساس جنم لیتا ہے۔ یہ قوت جنسی
 ت سے پیدا ہوتی ہے اور نشوونما کے مختلف مراحل میں اس قوت کے اظہار کے مقامات
 الگ ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے فرائیڈ کے بیان کردہ پانچ نفسی جنسی مراحل مندرجہ
 ہیں۔

ابتدائی دہن مرتکز عہد Oral Stage

فرد کی پیدائش سے لیکر ڈیڑھ سال تک کی عمر پر مشتمل ہوتا ہے جس میں تمام افعال کا مرکز
 کا منہ ہوتا ہے اور بچہ منہ سے انجام دینے والے مختلف افعال مثلاً دودھ پینا، کاٹنا اور
 نے سے لذت حاصل کرتا ہے۔ اس عہد کی تمام سرگرمیوں کا محور لا ذات کا نظام ہوتا ہے۔

مبرزئی عہد Anal Stage

ڈیڑھ سال کی عمر سے لیکر تین سال تک کی عمر پر محیط ہوتا ہے اس عہد میں بچہ بول و براز
 لے سے لذت حاصل کرتا ہے۔

جنسی عہد Phallic Stage

یہ عہد تین سال کی عمر سے لیکر چھ سال تک کی عمر پر پھیلا ہوا ہوتا ہے اس عمر میں بچہ اپنے جنسی اعضا سے لذت حاصل کرنا شروع کرتا ہے اور جنسی اعضا کی طرف اس کی توجہ بڑھ جاتی ہے۔ یہ تینوں ادوار قبل تناسلی دور Pre-Genital Stage بھی کہلاتے ہیں۔

(۴) انخفا کا دور یا سن بلوغت سے پہلے کا عہد Latency Period

چھ سال سے لیکر بارہ (۱۲) سال تک عمر کے اس عہد میں فوق الانا ترقی کرتی ہے بچہ اپنے ارد گرد کے ماحول میں دلچسپی لیتا اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔

(۵) تولد و تناسل کا عہد Genetal Stage

بارہ (۱۲) سال کی عمر سے لیکر بڑھاپے تک محیط اس عہد میں تبدیلیوں کی رفتار نمایاں طور پر تیز ہو جاتی ہے اس عہد میں فرد بالغ ہو جاتا ہے اور جنس مخالف میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

(ج) شخصیت کی حرکیات Dynamics of Personality

فرائیڈ کے مطابق مندرجہ ذیل جبلی قوتیں فرد کے کردار کے لئے توانائی مہیا کرتی ہیں۔

(۱) زندگی کی تحریک Eros

زندگی کی جبلت کے تحت بھوک، پیاس، ذات کا تحفظ اور جنسی جبلتیں شامل ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم جنسی جبلت ہوتی ہے۔

(۲) موت کی تحریک Thanatos

انفرادی سطح پر اس سے مراد ذاتی تباہی یا نقصان، خودکشی اور خود کو ضرر پہنچانا ہے جبکہ اجتماعی سطح پر اس سے مراد جنگ، قتل و غارت گری اور نظام کے خلاف بغاوت شامل ہے۔

یونگ کا نظریہ Yung's Theory

یونگ کے نظریے کو بھی تین حوالوں یعنی شخصیت کی ساخت، شخصیت کی اقسام اور شخصیت کی نشوونما کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے۔

Structure of Personality کی ساخت

کے نزدیک شخصیت مندرجہ ذیل تین نظاموں سے ترتیب پاتی ہے۔

(۱) شعوری انا Conscious Ego

ی انا سے مراد انسان کی شعوری یادیں، خیالات، احساسات اور ادراکات وغیرہ۔ یہ انا ذاتی لاشعور اور اجتماعی لاشعور میں توازن پیدا کرتی ہے۔

(۲) ذاتی لاشعور Personal Unconscious

لاشعور سے مراد افراد کی زندگی کی تلخ اور شیریں یادوں کا ذخیرہ ہوتا ہے اس میں ذاتی بات اور یادیں محفوظ ہوتی ہیں۔

(۳) اجتماعی لاشعور Collective Unconscious

سے مراد آباؤ اجداد اور نسل در نسل ورثے میں ملنے والے تجربات، احساسات، بات اور دیگر نفسیاتی خصوصیات ہوتی ہیں جو ایک فرد کسی گروہ، قبیلے، قوم کا فرد ہونے کے واسطے وصول کرتا ہے۔ یہ شخصیت کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ بالعموم مختلف نسلوں، قبائل، اقوام کا اجتماعی لاشعور یکساں ہوتا ہے۔

Structure of Personality کی اقسام

نے رویوں کے اعتبار سے شخصیت کو دو (۲) اقسام میں تقسیم کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اندرون بین Introverts

اندرون بین سے مراد ایسی شخصیت ہوتی ہے جس کی دلچسپیوں کا محور صرف اپنی ذات ہوتی ہے اور بیرونی دنیا سے اس کا تعلق کم ہوتا ہے۔ اس قسم کی شخصیت کے سماجی تعلقات کم

ہوتے ہیں اور وہ محفلوں میں جانے سے گھبراتا ہے۔ اس قسم کی شخصیت اپنے مفادات کی خوگر ہوتی ہے۔ یہ لوگ حال کی بجائے مستقبل میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور اس کے بارے میں متفکر بھی رہتے ہیں۔

(ب) بیروں بین Exteroverts

اس ضمن میں آنے والی شخصیت داخلی کیفیت کی بجائے بیرونی دنیا اور ماحول میں زیادہ دلچسپی لیتی ہے اُن کی دلچسپیاں اور حلقہ احباب وسیع ہوتا ہے یہ پر اعتماد ہوتے ہیں اور اندرون بین کی طرح خود غرض اور مفاد پرست نہیں ہوتے بلکہ ذاتی مفاد کو دوسروں کے مفاد یا قومی اور ملی مفاد پر قربان کر دیتے ہیں اس کے علاوہ یونگ نے افراد کی دیگر حوالوں سے بھی درجہ بندی کی ہے

شخصیت کی نشوونما Personality Development

یونگ کے نظریے کے مطابق شخصیت کی نشوونما کے تین دور ہوتے ہیں۔

(الف) بچپن Childhood

یہ شخصیت کی نشوونما کا ابتدائی عہد ہے جو بنیادی طور پر سیکھنے سے عبارت ہے جسمیں بچہ اپنے اردگرد کے ماحول اور مختلف سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور مذہبی اقدار سے واقف ہوتا ہے

(ب) نوبلوغت Adolescence

یہ ذہن اور جسم کی پختگی کا دور ہے جس میں فرد اپنی اور دوسروں کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہوتا ہے۔

بلوغت Adulthood

کا تیسرا دور ہے جو تمام عمر پر محیط ہوتا ہے جس میں جذباتی اور فکری لحاظ سے ٹھہراؤ آتا ہے۔

Adler's Theory of Personality

اشخصیت کا نظریہ

نے اپنے نظریہ شخصیت میں لا ذات کی بجائے انا کو زیادہ اہمیت دی ہے اس کے نزدیک ن کی نشوونما میں سماجی کردار اور بچے کے والدین اور دیگر لوگوں سے تعلقات اہم کردار تے ہیں اس کے نزدیک شخصیت کی نشوونما تا حیات ہوتی رہتی ہے۔ اس نے اپنے کی بنیاد فرد کے احساس کمتری پر رکھی ہے۔ ایڈلر کے نزدیک ہر فرد پیدائشی طور پر اور اقتدار کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یہ خواہش پیدائش سے لیکر موت تک برقرار رہتی جو شخصیت کوشش کے باوجود اس میں کامیاب نہیں ہوتی وہ احساس کمتری کا شکار ہو ہے۔ نتیجے کے طور پر احساس کمتری کو قابو میں کرنے کا جذبہ سب سے بنیادی تحریک پر سامنے آتا ہے۔ اس احساس کمتری کی شکل کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ اگر فرد زندگی کے شعبے میں کمزوری اور محتاجی محسوس کرتا ہے تو وہ احساس کمتری پر منتج ہوتی ہے۔

نظریے کے مطابق فرد کی پوری زندگی اپنی کمزوریوں پر قابو پانے میں گذر جاتی ہے اور بلوغت سے وہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتا ہے اسی کو بہتر بنانے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے حوالے سے بعض اوقات نمایاں کامیابیاں حاصل کر لیتا ہے۔ تاہم اگر ایسا نہ ہو اور اپنی کی تلافی کے لیے فرد ناقص اور بھونڈی حکمت عملی اختیار کرے اور نا کامیاب رہے تو رت میں افراد بڑے بھونڈے طریقے سے اپنی کامیابی کا راگ الاپتے ہیں اس صورت ایڈلر کی اصطلاح میں بیش تلافی (Over Compensation) کہا جاتا ہے۔

دوسری طرف اگر احساس کمتری شدت اختیار کر جائے تو فرد مختلف قسم کے نفسیاتی خوفوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اسے اصطلاحاً ”کمتری کا الجھاؤ“ یا ”احساس کمتری“ (Inferiorty Complex) کہا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں فرد تشویش کا شکار ہو جاتا ہے۔

انسانی شخصیت کے تعین کے حوالے سے متذکرہ بالا نظریات کے علاوہ بھی کئی نظریات پیش کئے گئے ہیں جو انسانی شخصیت کے مختلف اوصاف کی بنیاد پر شخصیت کی تشکیل کے دعوے دار ہیں جو اصحاب اس حوالے سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس موضوع پر لکھی جانی والی نفسیات کی مختلف کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہاں اجمالاً چند نظریات کو سامنے لانے کا مقصد انسانی فکر اور وحی کی تعلیمات کے مابین بنیادی بُعد کو سامنے لانا ہے۔

جہاں تک شخصیت کی ساخت اور اس کی نشوونما کے حوالے سے مختلف نظریات کا تعلق ہے، ان نظریات کو پیش کرنے والوں کا تعلق خواہ کسی بھی مکتبہ فکر سے ہو بعض امور ان تمام نظریات میں مشترک ہیں مثلاً:

۱۔ یہ تمام نظریات وحی کی تعلیمات سے یکسر بے بہرہ ہیں لہذا اس تناظر میں انسانی شخصیت کو صرف دنیا تک محدود رکھا جاتا ہے اس حوالے سے حیات بعد الموت یا حیات اخروی کا کوئی تصور نہیں ہے۔

۲۔ چونکہ خدا کا کوئی تصور نہیں لہذا اخلاقی اقدار کا بھی کوئی وجود نہیں اس بنیاد پر اعمال صالحہ اور مبنی پر ظلم افعال اور ان افعال کا انسانی شخصیت پر اثرات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا جاتا کیونکہ افعال کی اس قسم کی درجہ بندی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اس تناظر میں ان وجوہات پر تو بحث ہوتی ہے کہ کوئی انسان چند مخصوص افعال کیوں انجام دیتا ہے؟ یا اس کے

تات کیا ہوتے ہیں؟ لیکن یہ افعال خود انسانی شخصیت پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں یا کہہ لیجئے کہ انسانی افعال خود انسانی شخصیت کی ترکیب پر کیا اثرات مرتب کرتے ہیں حوالے سے مباحث تشنہ ہیں۔

تمام تر توجہ ان داخلی اور خارجی عوامل پر مرکوز ہوتی ہے جو انسانی شخصیت پر اثر ز ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے اگر مختلف مفکرین کے نظریات کا جائزہ لیا جائے تو بھی صورتحال سامنے آتی ہے کہ ایک مفکر چند مخصوص عوامل کو انسانی شخصیت کی بنیاد متصور کرتا دوسرا چند دیگر عوامل کو اسی طرح دیگر مفکرین اپنے اپنے اعتبار سے مختلف عوامل کو انسانی سیت کی تعمیر کا سبب شمار کرتے ہیں۔

انسانی شخصیت کی مختلف حوالوں سے مختلف النوع درجہ بندی کی جاتی ہے تاہم اس میں ایسی درجہ بندی نہیں کی گئی جس کا تعلق خدا پر ایمان لانے یا نہ لانے سے ہو۔ ایمان بذات انسانی شخصیت پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے اس حوالے سے مباحث نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انسان صرف اپنی دنیاوی معاملات کا کس انداز میں سامنا کرتا ہے اس کے لیے اپنے مورثی اور خارجی عوامل کے زیر اثر کس قسم کے طرز عمل کا مظاہرہ کرتا ہے بیشتر صورتوں انسانی شخصیت کی گروہ بندی اسی تناظر میں کی جاتی ہے۔

صورتحال کے نتیجے میں انسانی شخصیت اور اس کے اعمال وغیرہ کا تجزیہ صرف ایک موص تناظر میں ممکن رہ جاتا ہے جبکہ تصویر کا دوسرا رخ جو سب سے اہم ہے وہ نظروں سے اٹل ہو جاتا ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ہمیں ایک جامع اور مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن کی ہم کیا ہے اس پر آئندہ ابواب میں بحث کی جائے گی۔

قرآن کا تصورِ نفس

نفس

نفس قرآن مجید فرقان حمید کی ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ اس لفظ کا مادہ ن فس ہے اور یہ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں تقریباً تمام مقامات پر اسے انسانی شخصیت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جس میں انسانی شخصیت کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلو شامل ہیں۔ اسے شعور، عقل اور قلب (سوچنے سمجھنے کی صلاحیت) کے معنوں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ لفظ اس ”شے“ کے لیے بیشتر مقامات پر استعمال کیا گیا ہے جسے ”میں“ یا ”تم“ یا ”وہ“ کہا جاتا ہے۔ یعنی انسانی شخصیت۔ اقبال کی اصطلاح میں خودی (Self) یا انا (I-am-ness) یا ہونے کا احساس کہا جاتا ہے۔ انسانی شخصیت کے علاوہ یہ لفظ بھائی بند، خون اور سانس لینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اس کے علاوہ اس کا استعمال وسعت، کشادگی، ایک کش، گھونٹ، طویل چیز، ہلکی اور نرم ہوا کے نکلنے کے معنوں میں بھی کیا جاتا ہے۔

از روئے قرآن انسانی شخصیت دو اجزاء پر مشتمل ہے

قرآن کی رو سے انسانی شخصیت دو حصوں پر مشتمل ہے قرآن ان دونوں اجزاء کے لیے نفس کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ شخصیت کا جز اول ”انسان“ یا ”میں“ یا ”انا“ یا اس کا شعور ہے یہ انسان کی شعوری کیفیت ہے جو سوچنے سمجھنے تدبر کرنے کی صلاحیت یا غور و فکر سے

ت ہے جس سے انسان ایک باشعور مخلوق بنتا ہے۔ آئندہ مباحث میں اس جزو کے ’انسان‘ یا ’شعور‘ یا ’انسانی شعور‘ کی اصطلاح استعمال کی جائے گی۔ از روئے انسانِ انسانی شخصیت کا ایک دوسرا جزو بھی ہے قرآن اسے بھی ’نفس‘ کی اصطلاح سے ہے تاہم سیاق و سباق سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کا خطاب کس سے ہے۔ تک اس دوسرے جزو کا تعلق ہے آئندہ مباحث میں اس کے لئے ’نفس‘ یا ’نفسِ نسی‘ کی اصطلاح استعمال کی جائے گی۔

سے قبل کہ انسانی شخصیت کے ان دونوں اجزاء کی نوعیت و ماہمیت پر از روئے قرآن بحث نماز کیا جائے۔ یہ دعویٰ بذاتِ خود تصدیق کا طالب ہے کہ از روئے قرآن انسانی شخصیت اجزاء کا مرکب ہے لہذا پہلے اس حوالے اس حقیقت کو قرآن مجید سے ثابت کیا گیا کہ قرآن دو سے انسان دو حصوں سے ترکیب پاتا ہے۔ اس حوالے سے ذلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

وقت کہ انسان دو اجزاء کا مرکب ہے بدیہی طور پر اللہ تعالیٰ کی اپنی مشیت سے متعین ہ مختلف قوانین تخلیق میں سے ایک قانون کی مطابقت میں ہے جس کے تحت ہر تخلیق کی شکل میں ہوتی ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ
وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

(۳۶/۳۶)

پاک ہے وہ ذات جس نے ہر قسم کے جوڑے پیدا کیئے ہیں اس میں سے بھی جس کو زمین اگاتی ہے اور خود ان کے نفوس میں سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو وہ نہیں جانتے۔

جس طرح مشیت خداوندی سے متعین کردہ دیگر قوانین میں بھی استثناء کا کوئی تصور نہیں ہے اسی طرح یہاں بھی یہ ناممکن ہے۔ جب مشیت خداوندی سے یہ بات طے ہوگئی کہ ہر تخلیق جوڑوں کی شکل میں ہوگی تو انسان بھی اسی کی تخلیق ہے اور اس پر بھی یہ قانون اسی طرح منطبق ہوتا ہے جس طرح دیگر مخلوقات پر۔

اس آیت کریمہ سے ضمناً ایک نتیجہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ ایسی تمام چیزیں جو انسانی علم کے احاطے سے باہر ہیں ان کی تخلیق بھی اسی قانون کے تابع ہے یعنی انہیں بھی جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس سے لامحالہ یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ ایسی کائناتیں یا ایسی دنیا میں جو انسانی حیطہ ادراک سے باہر ہیں ان میں بھی انہی قوانین کا جزوی یا کلی طور پر اطلاق ہوتا ہے جو اس کائنات میں لاگو ہیں۔

اس عمومی اصول کو بالخصوص انسانوں کے حوالے سے سورۃ الشوریٰ کی مندرجہ ذیل آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

فَاِطْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلْ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ
 اَزْوَاجًا وَمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذُرُّكُمْ فِيْهِ
 لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۗ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيْرُ ۝

(۴۲/۱۱)

وہ آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے اس نے تمہارے نفس میں سے جوڑے بنائے اور چوپایوں کے جوڑے وہ تمہیں اس دنیا میں پھیلاتا ہے اس کی مثل کوئی شے نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

اس آیت کے الفاظ "جَعَلْ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا" موضوع زیر بحث کے حوالے

سے خصوصی تدبیر چاہتے ہیں دیکھئے کیا کہا جا رہا ہے "من انفسکم ازواجاً" ترجمہ "تمہارے نفوس میں جوڑے" یہ الفاظ صریحاً اس امر کے غماز ہیں کہ ہر انسانی شخصیت جوڑوں کی شکل میں ہے۔ اس پر مہر تصدیق سورۃ التکویر کی ابتدائی چودہ (۱۴) آیات ہیں۔ ان آیات میں روز قیامت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ان ابتدائی چودہ آیات میں سے پہلی سات (۷) آیات مندرجہ ذیل ہیں:

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۝ وَإِذَا
الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ وَإِذَا الْوُحُوشُ
حُشِرَتْ ۝ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّفُوسُ
زُوِّجَتْ ۝

(۸۱/۱-۷)

جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور تارے بے نور ہو جائیں گے اور جب پہاڑ ہلائے جائیں گے جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی جب وحشی جانور اکٹھے کئے جائیں گے جب دریا آگ ہو جائیں گے اور جب نفوس کے جوڑے ملا دیئے جائیں گے۔

سورۃ التکویر کی ان ابتدائی سات آیات میں اور اس کے بعد آنے والی مزید سات آیات میں بھی روز قیامت برپا ہونے والے مختلف واقعات کا بیان ہے۔ تاہم موضوع زیر بحث کے حوالے سے ساتویں آیت پر بالخصوص تدبیر لازمی ہے۔ یہاں واضح طور پر کہا جا رہا ہے کہ جب نفوس کے زوج (جوڑے) ملا دیئے جائیں گے۔ بالفاظ دیگر روز قیامت انسانی شخصیت کے دونوں حصے / اجزاء باہم ملا دیئے جائیں گے۔

آیت (۸۱/۷) میں استعمال کیا جانے والا لفظ "زوج" خصوصی تدبیر کا محتاج ہے۔ اس لفظ

کا مادہ زوج ہے اس کے معنی ان دو چیزوں کے ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے مطابق ہوں جس طرح دونوں پاؤں کے جوتے۔ یہ دو چیزیں جو زوج پا جوڑا ترتیب دیتی ہیں باہم متضاد یا مخالف بھی ہو سکتی ہیں جس طرح رات اور دن یہ دونوں مل کر بھی ایک جوڑا بناتے ہیں جسے دن کہا جاتا ہے تاہم یہاں اس کے اجزاء باہم متضاد ہیں۔ زوج اس فرد کو کہا جاتا ہے جس کا کوئی ساتھی ہو خواہ وہ بعینہ اسی جیسا ہو یا باہم متقابل۔ اسی بنیاد پر ایک ہی قسم کی چیزوں کو ازواج کہا جاتا ہے۔ زوج کے معنی ایسے فرد کے بھی آتے ہیں جس کا کوئی ساتھی یا نظیر و مثیل ہو۔ یہ لفظ دو ساتھیوں میں سے ہر ایک فرد کے لئے اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے جس طرح ان دونوں کے لئے۔ اسی طرح ازواج کے معنی شوہر یا بیوی یا دونوں کے ہیں۔ شوہر بیوی کا زوج ہوتا ہے اور بیوی شوہر کی زوج۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ تصریحات بالا سے واضح ہے کہ زوج سے مراد دو ایسی اشیاء کا جوڑا ہوتا ہے جو باہم مثیل ہوں یا مخالف بھی ہو سکتے ہیں۔ لہذا جب متذکرہ بالا آیت (۸۱/۷) میں یہ کہا گیا کہ نفوس کے جوڑے ملا دیئے جائیں گے تو اس کا لامحالہ مطلب یہ ہے کہ انسانی شخصیت جن دو اجزاء سے مل کر بنتی ہے انہیں باہم ملا دیا جائے گا۔ یہ امر اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانی شخصیت دو اجزاء سے مل کر بنتی ہے۔

(۲) انسانی نفس کے دو اجزاء پر مشتمل ہونے کی مزید تصدیق سورۃ النحل کی مندرجہ ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے۔

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا
وَتُوْتَىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۱۶/۱۱۱)

جس دن ہر نفس اپنے نفس سے جھگڑتا ہوا آئے گا اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا

پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں بھی آیت کے الفاظ پر غور کیجئے کیا کہا جا رہا ہے ”کل نفس تجادل عن نفسها“ ”ہر نفس اپنے نفس سے جدل کرتا آئے گا“ آیت کریمہ کے الفاظ اس امر کی کھلی کھلی شہادت ہیں کہ نفس کے دونوں اجزاء کے مابین اس روز جھگڑا ہوگا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ از روئے قرآن انسان دو اجزاء کا مرکب ہے جس پر یہ آیت بین شاہد ہے۔

اس دعویٰ کی تصدیق صرف متذکرہ بالا آیات سے ہی نہیں ہوتی بلکہ اس حوالے سے قرآن مجید کی مزید کئی آیات بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے چند آیات مندرجہ ذیل ہیں۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَإِنِّي فَاقِرٌ

بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٥١/٢٥﴾

موسیٰ نے کہا اے میرے رب! میں اپنے نفس کے سوا اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر ہرگز تصرف نہیں رکھتا اس لیے تو ہمارے اور فاسقین کے درمیان امتیاز کر دے۔

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ پر غور کیجئے ”میں اپنے نفس کے سوا اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر ہرگز تصرف نہیں رکھتا“۔ ان الفاظ سے واضح ہے کہ میں (حضرت موسیٰ علیہ السلام) اور ان کا نفس الگ الگ ہیں اگر دونوں ایک ہی ہوتے تو اس تمیز کو روار کھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

یہی طرح سورۃ المائدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۵/۱۰۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ

اے اہل ایمان! اپنے نفس کی حفاظت کرو۔

یہاں بھی واضح طور پر اہل ایمان الگ ہیں اور ان کے نفوس الگ اور اہل ایمان کو اپنے نفوس کی حفاظت کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس حفاظت سے کیا مراد ہے؟ اس پر بحث اسی باب میں آگے بہ عنوان ”اہل ایمان کو نفس کی حفاظت کا حکم“ کے تحت کی گئی ہے۔ اس حوالے سے سورۃ بنی اسرائیل کی مندرجہ ذیل آیات بھی دلیل کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں جہاں ارشاد ربانی ہے

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ

وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ، أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ

(۶/۹۳)

اور کاش تم ان ظالم لوگوں کو اس وقت دیکھو جب وہ موت کی سختیوں میں ہوں اور

ملائکہ (یہ کہتے ہوئے) ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنے نفوس۔

اس آیت پر تدبر سے بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جب ظالم لوگوں پر نزع کا وقت آتا ہے اور فرشتے انہیں موت دینے لگتے ہیں تو یہ نہیں کہا گیا کہ وہ (فرشتے) ظالم لوگوں کو موت دیتے ہیں بلکہ قرآن کے الفاظ پر غور کیجئے ملائکہ ان سے کہتے ہیں کہ ”اَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ“ (نکالو اپنے نفوس) یعنی ”ظالم لوگوں“ سے یہ کہا جا رہا کہ ”اپنے نفوس“ نکالو۔ یہاں پھر اس حقیقت کا اثبات ہوتا ہے کہ لوگ الگ ہیں اور ان کے نفوس الگ۔

۷) اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل کی مندرجہ ذیل آیت بھی اسی حوالے سے پیش کی جاسکتی ہے۔

إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا

(۱۷/۷)

اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے نفوس کے لیے کرو گے اور اگر بدی کرو گے تو اس کا

وبال بھی تمہارے نفوس پر ہوگا۔

یت بھی اسی حقیقت کا اعادہ کر رہی ہے آیت کے الفاظ پر غور کیجئے دیکھیے کیا کہا جا رہا، اگر "تم" نیکی کرو گے تو "اپنے نفوس" کے لئے کرو گے اور اگر "تم" بدی کرو گے تو اس کا "تمہارے نفوس" پر ہوگا۔ یہاں پھر انسان الگ ہیں اور ان کے نفوس الگ۔
 مومن میں خدائے علیم وخبیر کا ارشاد پاک ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنَادُونَ لَمَقْتُ اللَّهِ أَكْبَرُ مِنْ مَقْتِكُمْ
 أَنْفُسَكُمْ إِذْ تُدْعَوْنَ إِلَى الْإِيمَانِ فَتَكْفُرُونَ ۝

(۳۰/۱۰)

اور کافروں کو کہا جائے گا آج تم جتنا اپنے نفوس کو نفرت سے دیکھتے ہو اللہ کی تم سے نفرت اس سے زیادہ ہے اور جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم کفر کرتے تھے۔

یت پھر اس امر کی تصدیق کر رہی ہے کہ انسان اور اس کا نفس الگ الگ ہیں۔ یہاں طلب امر یہ ہے کہ روز قیامت "کفار" کی اپنے نفوس سے نفرت کا بیان دیا گیا۔ ظاہر ہے اگر کفار اور ان کا نفس ایک ہی چیز ہوتے تو کفار کی اپنے نفوس سے نفرت کے نامعنی نہیں رہتے۔

غمن میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات بھی اہم ہیں۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝
 وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝

(۵۱/۲۰-۲۱)

اور زمین میں یقین رکھنے والوں کے لیے بہت سی آیات ہیں اور تمہارے اپنے نفوس میں بھی کیا تم دیکھتے نہیں۔

آیات میں توجہ طلب امر یہ ہے کہ خطاب پوری نوع انسانی سے ہے کسی خاص گروہ /

قوم امت سے نہیں۔ یہاں انسانوں کو خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ تمہارے نفوس میں حق تعالیٰ کی کئی نشانیاں ہیں۔ یہاں بھی واضح طور پر انسانوں اور ان کے نفوس میں باقاعدہ تخصیص کی گئی ہے۔

(۸) اس حوالے سے مزید کئی آیات بھی پیش کی جاسکتی ہیں جہاں یہ تخصیص واضح طور پر روارکھی گئی ہے مثلاً ”اپنے نفوس کو پاک قرار مت دو“ (۵۳/۳۲)؛ ”تم نے اپنے نفوس کو خود عذاب میں ڈالا ہے“ (۵۷/۱۳)؛ ”اللہ کے راستے میں اپنے اموال اور نفوس سے جہاد کرو“ (۶۱/۱۱) ”اپنے اہل کو بھی اور اپنے نفوس کو بھی جہنم سے بچاؤ“ (۶۶/۶)؛ ”ہم خود اپنے نفوس کے خلاف گواہی دیتے ہیں“ (۶/۱۳۰)؛ انہوں نے اپنے نفوس کے خلاف گواہی دی“ (۶/۱۳۰)؛ ”اے ہمارے رب! ہم نے اپنے نفوس پر ظلم کیا“ (۷/۲۳)؛ ”وہ اپنے نفوس کے سوا کسی کو دھوکہ نہیں دیتے“ (۲/۹)؛ ”وہ خود اپنے نفوس پر ظلم کر رہے تھے“ (۲/۵۷)؛ ”وہ امر بہت برا ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنے نفوس کو بیچ رکھا ہے“ (۲/۹۰)۔ ان آیات کے علاوہ (۲/۱۰۲)، (۲/۱۰۹)، (۲/۲۶۵)، (۳/۱۱۷)،

(۳/۱۳۵)، (۳/۶۴)، (۳/۶۵)، (۴/۹۷)، (۴/۱۰۷)، (۴/۱۱۳)، (۵/۷۰)، (۵/۸۰)، (۶/۱۲)، (۶/۲۰)، (۶/۲۲)، (۶/۲۶)، (۶/۱۲۳)، (۷/۹)، (۷/۱۳۷)، (۷/۱۶۰)، (۷/۱۷۲)، (۷/۱۷۷)، (۷/۱۹۲)، (۷/۱۹۷)، (۸/۵۳)، (۹/۱۷)، (۹/۲۰)، (۹/۲۲)، (۹/۵۸)، (۱۳/۱۶)، (۱۶/۲۸)، (۱۶/۳۳)، (۱۶/۱۱۸)، (۱۸/۵۱)، (۲۱/۶۴)، (۲۱/۱۰۲)، (۲۲/۱۰۳)، (۲۲/۶)، (۲۵/۲۱)، (۲۵/۲۱)، (۲۹/۲۰)، (۳۰/۸)، (۳۰/۹)، (۳۰/۲۲)، (۳۳/۶)، (۳۳/۱۹)، (۳۹/۵۳)، (۴۱/۵۳)، (۴۲/۲۵)، (۵۸/۸)، (۵۹/۹)، (۵۹/۱۹)

وغیرہ میں بھی واضح طور پر انسان اور اس کے نفس میں امتیاز روارکھا گیا ہے۔

اس امر کی از روئے قرآن تصدیق کے بعد انسانی شخصیت دو حصوں پر مشتمل ہے ذیل میں ان اجزاء کی نوعیت اور ماہیت پر بحث کی گئی ہے۔

انسانی شخصیت کا جزو اول: انسانی شعور

یہاں تک قرآن مجید فرقان حمید کا تعلق ہے قرآن مجید نفس کی اصطلاح کو انسانی شعور یا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یا غور و فکر کے حوالے سے بھی استعمال کرتا ہے۔

نفس کی اصطلاح بمعنی شعور

آن مجید میں نفس کی اصطلاح کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور دل کی بات کے معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یا شعور کے معنوں میں اس کا استعمال مندرجہ آیات میں کیا گیا ہے۔

✓ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُوْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَ
يَجْعَلُ الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (۱۰/۱۰۰)

کسی نفس کو یہ طاقت حاصل نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر ایمان لے آئے اور وہ اپنا غضب ان لوگوں پر (نازل) کرتا ہے جو عقل رکھتے ہوئے اس سے کام نہیں لیتے۔

قرآن مجید میں ایمان کی دعوت کے لئے کہیں جبر کا سہارا نہیں لیا گیا بلکہ قرآن قدم اس مقصد کے لئے دلائل پیش کرتا ہے لہذا ایمان با بصیرت لایا جاتا ہے نہ کہ کسی لالچ کے تحت۔ بصیرت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا دوسرا نام ہے لہذا جب اس آیت میں یہ لیا کہ کوئی نفس اللہ کے حکم کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا تو اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک

کوئی شخص فکر اور تدبیر سے کام نہیں لے گا قرآنی دلائل و براہین پر غور نہیں کرے گا ایسا نہیں لاسکتا۔ ایمان لانے کے لیے یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے یہی وجہ ہے کہ آیت کے دوسرے حصے میں ان لوگوں پر غضب کی بات کی گئی ہے جو فکر و تدبیر سے کام نہیں لیتے اور محض حیوانی سطح پر زندگی گزارتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہاں نفس سے مراد انسانی غور و فکر اور تدبیر کی صلاحیت کا استعمال ہے یا انسانی شعور ہے۔

اسی طرح سورۃ الروم میں نفس کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یا شعور کے معنوں استعمال کیا گیا ہے

أُولَٰئِكَ يَتفَكَّرُونَ فِي أَنفُسِهِمْ تَمَّا خَلَقَ اللَّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَدَّدٍ
 إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِإِقْبَائِي رَبِّهِمْ لَكٰفِرُونَ ۝ (۳۰/۸)

کیا ان لوگوں نے اپنے نفوس (دلوں) میں تدبیر نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اس کو حکمت سے اور ایک مقررہ وقت کے لیے پیدا کیا ہے اور بہت سے لوگ اپنے رب سے ملنے کے قائل ہی نہیں ہیں۔

اس آیت میں قطعی واضح اور دو ٹوک انداز میں نفس کی اصطلاح کو غور و فکر اور تدبیر کی صلاحیت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح دو مقامات پر نفس کی اصطلاح کو دل کی بات کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے مثلاً سورۃ البقرہ میں ارشادِ باری ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ
 أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ

(۲/۲۳۵)

اور عورتوں سے نکاح کی درخواست کے متعلق جو بات تم اشارۃً (ان سے) کہو یا اپنے نفوس میں رکھو اس پر تمہیں کوئی گناہ نہیں۔

رح سورۃ بنی اسرائیل میں خدائے علیم و حکیم کا ارشاد پاک ہے۔

رَبِّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِنَّ تَكُونُوا صٰلِحِينَ فَإِنَّ
كَانَ لِلذَّٰوَابِ عِزٌّ

(۱۷/۲۵)

جو کچھ تمہارے نفوس میں ہے تمہارا رب اس سے بخوبی واقف ہے اگر تم صالحین
میں ہو گے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بخش دینے والا ہے۔

بالا دونوں آیات (۲/۲۳۵) اور (۱۷/۲۵) میں نفس کو بمعنی قلب (دل کی بات)
کیا گیا ہے۔ گویا از روئے قرآن نفس سے مراد انسان کی فکر و تدبیر یا سوچنے سمجھنے کی
یا شعور ہے۔

معنی انسانی شخصیت (بہ حیثیت مجموعی)

نفس میں متعدد مقامات پر انسانی شخصیت کو بہ حیثیت ایک اکائی خطاب کیا گیا ہے اور
اس سے پکارا گیا ہے۔ اس حوالے سے چند آیات کریمہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۷۲/۲۸)

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رٰهِيْنَةٌ ۝

ہر نفس اپنے کسب (اعمال) کے عوض گروی ہے۔

(۸۱/۱۴)

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ۝

تب ہر نفس معلوم کرے گا کہ وہ کیا لیکر آیا ہے۔

(۸۲/۵)

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ۝

تب ہر نفس کو معلوم ہوگا کہ اس نے آگے کیا بھیجا تھا اور پیچھے کیا چھوڑا تھا۔

يَوْمَ لَا تَبْلُغُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ۝

(۸۲/۱۹)

جس روز کوئی نفس کسی دوسرے نفس کا بھلا نہ کر سکے گا اس روز صرف اللہ کا حکم ہوگا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًى وَلَٰكِن حَقَّ الْقَوْلُ

(۳۲/۱۳)

مِنِّي لَأَمْلِكَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝

اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو ہدایت دے دیتے لیکن میری طرف سے یہ بات قرار پا چکی ہے کہ میں جہنم کو جن وانس سے بھر دوں گا۔

وَ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ

(۴۵/۲۲)

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝

اور اللہ نے سماوات اور زمین کو بالحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر نفس اپنے کسب کا بدلہ پائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

نہ صرف متذکرہ بالا آیات بلکہ قرآن مجید میں دیگر کئی مقامات پر بھی انسان کو بہ حیثیت ایک

اکائی خطاب کیا گیا ہے مثلاً (۲/۴۸)، (۲/۱۲۳)، (۲/۲۳۳)، (۲/۲۸۱)، (۳/۳۰)،

(۳/۱۴۵)، (۳/۱۶۱)، (۳/۱۸۵)، (۶/۱۶۳)، (۱۰/۳۰)، (۱۰/۱۰۰)، (۱۱/۱۰۵)،

(۱۳/۳۳) اور (۱۳/۵۱) وغیرہ۔

اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں نفس کی اصطلاح کا ایک حوالہ انسانی شعور یا اس کی مکمل شخصیت ہے۔

نفس (شعور انسانی) اور اس کی سطحیں:

شعور کی دو (۲) سطحیں ہوتی ہیں ایک ابتدائی اور دوسری ثانوی۔ ابتدائی سطح سے مراد وہ سطح

ہے جہاں شعور صرف زندگی کی مقتضایات پورا کرنے تک محدود ہو۔ ان ضروریات میں
 تقاضوں بھوک، پیاس، جنسی خواہشات کی تکمیل اور تحفظِ ذات کے تقاضوں کی تکمیل
 ہے۔ یہ حیوانی سطح ہے جہاں صرف جسمانی تقاضوں کی تکمیل ہی منہبائے نظر ہوتی ہے
 سے ماسوا کچھ نہیں۔ شعور کی دوسری یا ثانوی سطح سے مراد وہ سطح ہوتی ہے جہاں فکر و تدبیر، فہم
 حاصل ہوتی ہے اس سطح کی بنیادی خصوصیت قوت اختیار و ارادہ اور اس کا استعمال ہوتا
 ابتدائی سطح پر ناپید ہوتی ہے۔ اس امر سے قطع نظر کہ اس عطیہ خداوندی کا استعمال کس
 یا جاتا ہے یہ نعمت بہر حال اس سطح پر حاصل ہوتی ہے۔ شعور کی یہ سطح انسانوں اور جنات
 ہے ان دونوں انواع کو اختیار و ارادہ کی قوت دی گئی ہے۔ اور یہ انواع اپنے جسمانی
 کی تکمیل کیساتھ فکر و تدبیر اور قوت فیصلہ کی خصوصیات کی بھی حامل ہیں جو شعور کی ایک
 ہے۔ انسانوں کے حوالے سے جب انسان اس ابتدائی سطح کے تقاضوں کی تکمیل کرتا
 سے نفس امارہ کہا جاتا ہے جو محض اس ابتدائی سطح کے تقاضوں کی تکمیل پر محیط ہوتا ہے۔ اسے
 اور صرف حیوانی تقاضوں کی تکمیل کی فکر ہوتی ہے اس مقصد کے لیے وہ جائز اور
 لال یا حرام کے تقاضوں سے ماوراء صرف لذت کے حصول کا متلاشی ہوتا ہے چاہے
 ایسے ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ اگر ایک انسان صرف ان تقاضوں کی تکمیل تک اپنے
 دود کر لے تو وہ یقیناً حیوانی سطح پر زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ جس کا منہبائے مقصود صرف
 لذت دنیا ہوتی ہے اس سے ماسوا کچھ نہیں۔ تاہم اگر انسان اس سطح سے اوپر اٹھتا ہے
 فی سطح پر پہنچتا ہے جہاں اس کا منہبائے مقصود رضائے الہی کا حصول ہوتا ہے۔ اس
 لیے وہ ان احکامات و قوانین کی پاسداری کرتا ہے جو اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ

نے قرآن مجید میں بیان کئے ہیں یہاں وہ اپنے جسمانی تقاضوں کی تکمیل بھی اللہ کی متعین کردہ حدود میں کرتا ہے اور اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ وہ مرحلہ آجاتا ہے جسے قرآن نے نفس مطمئنہ کہہ کر پکارا ہے یعنی وہ مرحلہ جب انسان اپنے رب سے اور رب اپنے بندے سے راضی ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے مزید بحث اسی باب میں بہ عنوان ”نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ“ کے تحت آگے کی گئی ہے۔

نفس اور جسم کا تعلق

شعور خواہ وہ کہیں بھی ہو کسی بھی سطح پر ہوا اپنے اظہار کے لیے کسی نہ کسی جسمانی ہیئت کا متقاضی ہوتا ہے اس حوالے سے متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں

(آ) از روئے قرآن یہ کائنات باشعور ہے نہ صرف یہ کہ باشعور ہے بلکہ اللہ نے اسے اختیار اور ارادہ کی صلاحیت بھی دی ہے۔

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا
وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ﴿۵۱﴾

(۴۱/۱۱)

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو اس نے آسمان اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے انہوں نے کہا ہم خوشی سے آتے ہیں۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین دونوں کو نہ صرف شعور عطا کیا ہے بلکہ انہیں اختیار اور ارادہ کی دولت سے بھی نوازا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اور آسمان اور زمین کے مابین جس مکالمے کا تذکرہ اس آیت میں کیا گیا ہے وہ ممکن ہی نہ تھا۔

یہاں شعور کا ظہور آسمان اور زمین کی شکل میں ہوا ہے۔

تمام نباتات، جمادات و حیوانات بلکہ کائنات کی تمام اشیاء بھی شعور کی حامل ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

تَسْبِيحٌ لَهُ السَّمَوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ
مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ
إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ۝

(۱۷/۲۳)

تمام آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں ہیں سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور
(مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کیساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم
ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے بے شک وہ بردبار اور غفار ہے۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ کائنات کی تمام اشیاء خدا کی حمد و ثنا کرتی ہیں اور حمد و ثنا بغیر
شعور کے ممکن نہیں ہے یہ الگ مسئلہ ہے کہ انسان اس حمد و ثنا کا شعور نہیں رکھتے۔ یہاں شعور
کا قالب اشیاء کائنات ہیں۔

زرورے قرآن جنات ایک مکمل نوع ہیں جن کے نمائندے کی حیثیت سے شیطان کو اللہ تعالیٰ
قرآن مجید میں سامنے لاتا ہے۔ یہ بھی ایک باشعور نوع ہے جس کی تخلیق جلتی ہوئی آگ کے
دھوئیں سے کی گئی (۵۵/۱۵) بہ حیثیت نوع ان میں تولید و تناسل کا سلسلہ جاری
ہے۔ (۱۸/۵۰) یہ تعداد میں کثرت سے ہیں (۱۷/۶۳) ان کی نوعی ساخت اس قسم کی ہے کہ وہ
انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں لیکن انسان انہیں نہیں دیکھ سکتے (۷/۲۷) ان کی تخلیق انسانوں سے
پہلے ہوئی تھی (۱۵/۲۷) ان کو بھی اختیار و ارادہ کی قوت دی گئی ہے۔ اسی بنیاد پر جب اللہ تعالیٰ
نے جملہ کائناتی قوتوں (ملائکہ) کو انسان کو سجدے کا حکم دیا تو شیاطین نے انکار کر

دیا (۱۸/۵۰) یہ حکم عدولی اس نوع کی جانب سے نئی نہیں تھی بلکہ یہ نوع پہلے ہی سے کافر تھی (۲/۳۳)۔ (ان نکات پر تفصیلی بحث میری کتاب ”ارتقاء حیات از روئے قرآن“ میں ملے گی)۔

تاہم اس امر سے قطع نظر کہ انسان جنات کو نہیں دیکھ سکتے یہ امر طے شدہ ہے کہ یہ ایک باشعور نوع ہے یہاں بھی شعور کسی نہ کسی جسمانی ساخت کا طالب ہے اور جنات (شیاطین) کی جسمانی ہمیت کی طرف قرآن مجید میں واضح اشارات موجود ہیں مثلاً:-

إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ۝

طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ۝ (۶۵-۶۴/۳۷)

وہ ایک درخت ہے (تھوہر کا) جہنم کے اسفل میں سے اگے گا اس کے خوشے ایسے ہوں گے جیسے شیطانوں کے سر۔

اس آیت میں واضح طور پر جہنم کے اسفل میں سے اگنے والے ایک مخصوص درخت (تھوہر) کے خوشوں کی بابت کہا گیا ہے کہ وہ شیاطین کے سروں سے مشابہ ہیں۔ بالفاظ دیگر شیاطین بھی ایک مخصوص ہیئت کے حامل ہیں۔ اسی طرح سورۃ الکہف میں اس نوع میں تولید و تناسل کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا ۝

إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ

رَبِّهِ إِذْ قَتَلَهُ وَأَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ أُولَآئِكَ مِنْ دُونِ

وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا ۝

(۱۸/۵۰)

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس

کے وہ جنات میں سے تھا تو اپنے رب کے حکم سے باہر ہو گیا تو کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں اور شیطان کی دوستی ظالموں کے لئے (خدا کی دوستی کا) برابر ہے۔

جنات کی اولاد ظاہر ہے کسی نہ کسی شکل میں ہی ہوگی لہذا یہ نوع بھی کسی نہ کسی حیثیت کی حامل ہے اور باشعور ہے۔ یہاں بھی شعور بمعنی میں ظاہر ہوا ہے چاہے اس کی نوعیت انسانی فہم و بصیرت سے ماوراء ہی کیوں نہ ہو۔

زرورے قرآن زمین پر حیات کوئی عجوبہ نہیں ہے نہ ہی انسان اس زمین پر کوئی پہلی باشعور مخلوق ہے بلکہ انسانوں سے پہلے بھی اس زمین پر متعدد باشعور انواع پیدا ہو کر ختم ہو چکی ہیں اور انسان انہی ناپید ہو جانے والی انواع میں سے ایک مخلوق جو زرورے قرآن اس زمین پر بننے کی سب سے زیادہ اہل تھی اس کا جانشین ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ”ارتقائے حیات از زرورے قرآن“)۔ ان ختم ہو جانے والی انواع کی ایک مایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ زمین پر اپنے آثار بنانے میں بہت ماہر تھے بالفاظ دیگر مختلف قسم کی تعمیرات میں لاجواب تھے اور تعمیر پھر شعور کی محتاج ہوتی ہے لہذا الامحالیہ ان ختم ہونے والی انواع میں بھی شعور موجود تھا اور یہ انواع بھی کسی نہ کسی جسمانی حیثیت کی بھی حامل رہی ہوں گی لہذا یہاں بھی شعور نوعی ساخت کا محتاج پڑا

عینہ یہی صورت حال نباتات، حیوانات اور انسانوں کے ساتھ بھی ہے۔ نباتات و حیوانات شعور کی پہلی سطح پر ہوتے ہیں۔ انہیں خدا کی حمد و ثنا کا شعور دیا گیا ہے تاہم فکر و تدبیر اور اختیار ارادہ کے جوہر سے محروم ہیں انسان بہ لحاظ شعور ان دونوں سے آگے ہے اور ایک باشعور نوع کی حیثیت سے کرہء ارض پر موجود ہے اور چونکہ باشعور ہے لہذا یہ شعور بھی کسی نہ کسی

جسمانی حیثیت کا محتاج ہے جو انسانی جسم کی شکل میں ظہور کرتا ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ شعور جب کسی بھی نوع کے جسم میں ظہور کرتا ہے تو دونوں میں کوئی خط امتیاز کھینچا جانا ممکن نہیں رہتا۔ یہ تصوف کی اصطلاح میں من تو شدی تو من شدی کی صورت حال ہوتی ہے۔ جسم کے کسی بھی حصے پر لگنے والی چوٹ خواہ وہ معمولی ہو یا شدید اس کا اثر شعور محسوس کرتا ہے اور تمام شعوری کیفیات جسم پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہیں چاہے شعور کی سطح کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ شعور کی کسی بھی سطح پر جسم اور شعور کی ہم آہنگی ہمیشہ نسب سطح پر ہوتی ہے۔ اس کی مثال اس طرح سے دی جاسکتی ہے کہ فرض کیجئے ایک خاص مقام پر ایک پتھر موجود ہے یہ پتھر چونکہ جامد ہے لہذا اس میں مخفی توانائی (Potential Energy) موجود ہوگی۔ جو اس کے پورے وجود میں سرایت کیئے ہوئے ہے۔ یہاں یقیناً اس پتھر کے کسی خاص نقطے کی نشاندہی کر کے یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس کی مخفی توانائی اس خاص نقطے یا کسی دوسرے خاص نقطے پر مرکوز ہے۔ وہ اسی پتھر کے پورے وجود کا حصہ ہے اب اگر اسی پتھر کو حرکت دی جائے تو اس پتھر کی مخفی توانائی، حرکی توانائی (Kinetic Energy) میں تبدیل ہو جائے گی اور جب تک وہ پتھر حرکت کرتا رہے گا اس کی حرکی توانائی استعمال ہوتی رہے گی اور جب وہ دوبارہ ساکن ہو جائے گا تو اس کی حرکی توانائی پھر دوبارہ اس کی مخفی توانائی میں تبدیل ہو جائے گی۔

یہی مثال شعور اور جسم کے باہمی تعلق پر صادق آتی ہے۔ شعور بنیادی طور پر ماسوا توانائی اور کچھ نہیں ایک ایسی توانائی جو فہم و ادراک کی خصوصیات سے متصف ہے۔ بظاہر یہ بات بعید از عقل و قیاس معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت ایسا ہی ہے۔ مقام تدبیر یہ ہے کہ خود خالق کائنات، ذات برحق نے قرآن مجید میں اپنا تعارف کن الفاظ میں کروایا ہے۔

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ مِثْلُ نُورِ كَمِيْنَةِ
 فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا
 كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبْرَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ
 وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارُ نُورٍ
 عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَيَضْرِبُ اللَّهُ
 الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

(۲۴/۳۵)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور قندیل گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارہ ہے اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے (یعنی) زیتون کہ نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف اس کا تیل خواہ آگ اسے نہ بھی چھوئے (تو بھی) جلنے کو تیار ہے نور پر نور ہے اللہ اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کو سمجھانے کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔

یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو زمین اور آسمانوں کا نور قرار دیا ہے۔ نور ہر قسم کی روشنی (توانائی) کو کہا جاتا ہے۔ جب خالق کائنات کا خود اپنے متعلق ارشاد ہے کہ وہ اس کائنات کا نور یا توانائی ہے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ توانائی با شعور نہیں ہو سکتی؟ یہاں ایک امر اور بھی قابل توجہ ہے کہ انسان، شعور کی موجودہ سطح پر اللہ کی ذات و باہمیت کی بابت کچھ نہیں جان سکتا یہ ممکن ہی نہیں کیونکہ انسان کو اتنا شعور ہی نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن روزِ قیامت جب حیات دوبارہ ملے گی تو یقیناً جسمانی اعضا تو یہی ہوں گے جن سے انسانی جسم

عبارت ہے اس حوالے سے کئی قرآنی آیات کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جہاں روز قیامت اور اس کے بعد جنت اور دوزخ میں صد فیصد انہی اعضا اور ان کے انہی افعال کا تذکرہ کیا گیا ہے جو اس دنیا میں انسانوں کے ہوتے ہیں یا ان سے جو کام ہم لیتے ہیں مثلاً جنتیوں کے متعلق متعدد مقامات پر آنکھوں کی ٹھنڈک، انواع و اقسام کی غذاؤں وغیرہ کا تذکرہ موجود ہے اسی طرح دوزخ میں شدید گرم پانی پینے کو ملنے کا تذکرہ ہے آگ سے مختلف جسمانی اعضاء کے جلنے وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ جسمانی نوعیت بہر حال اس زندگی کی نہیں ہوگی ورنہ جہنم میں مسلسل جسم کے جلنے اور مختلف انواع اذیتوں کو ہماری موجودہ جسمانی ہیئت یقیناً برداشت نہیں کر سکتی۔

اس امر کی شہادت سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۹۸ سے ہوتی ہے جہاں ارشادِ ربانی ہے

ذٰلِكَ جَزَاءُ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَئِن كُنَّا

عِظَامًا وَرُفَاتًا اِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۝ (۱۷/۹۸)

یہ سب ہماری آیتوں سے کفر کرنے اور یہ کہنے کا بدلہ ہے کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزے ریزے ہو جائیں گے تو کیا ہمیں نئی مخلوق کی صورت میں اٹھایا جائے گا۔

لیکن توجہ طلب امر یہ ہے کہ جب انسان کی جسمانی نوعیت تبدیل ہوگی تو اسے ایک نعمت اور بھی ملے گی اور وہ باری تعالیٰ کی دید کی سعادت ہوگی۔

وَوَدَّ يَوْمَئِذٍ تَوَسَّدَ بِاُخْرَىٰ ۝

(۷۳/۲۲-۲۳)

اِلٰى رَيْثِهَا نَاطِرَةٌ ۝

اگر روزِ بہت سے چہرے پر رونق ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔

وع زیر بحث کے حوالے سے اصل نکتہ یہ ہے کہ جب انسان کو باری تعالیٰ کی دید کی
ت نصیب ہوگی تو ذات باری تعالیٰ یقیناً کسی نہ کسی خاص شکل یا ہئیت میں ہوگی جیسی تو
ان سے دیکھ سکیں گے ورنہ ایک ایسی ہئیت جو ہمہ اطراف بٹھری ہوئی ہو اسے دیکھنا
نہیں۔ اب اگر ایسا ہے جس کے نہ ہونے میں کوئی امر مانع نہیں کیونکہ خود قرآن اس پر
مد ہے تو اس کا لامحالہ مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی ذات کی بھی کوئی نہ کوئی ہئیت لازمی ہونی
پئے اور یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اللہ اس کائنات کا نور ہے لہذا لامحالہ یہ نور یا اللہ کی
ت بھی کسی نہ کسی حوالے سے ہئیت کی حامل ہونی چاہئے۔ تو جب اللہ کی ذات کسی نہ کسی
لے سے اگر کسی ہئیت کی حامل ہے تو انسان جو اس منبع نور و حکمت سے متصف انتہائی
ذره ہے اس کا شعور بھی جسمانی ہئیت کا محتاج ہوگا جو اس کا جسم ہوتا ہے اور یہ باشعور
ائی ہے۔ اس کا مزید ثبوت سورۃ البقرہ کی مندرجہ ذیل آیت سے بھی ملتا ہے:

كَيْفَ نَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ

(۲/۲۸)

يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○

تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے اسی نے تمہیں زندہ کیا پھر
تمہیں موت دے گا پھر زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

آیت میں انسانی حیات کی پوری ترتیب کا بیان دیا گیا ہے۔ پہلے انسان مردہ ہوتا ہے
سے زندگی ملتی ہے پھر مرجاتا ہے اور پھر اسے روز قیامت دوبارہ زندگی ملے گی۔ تاہم
طلب امر یہ ہے کہ موجودہ زندگی سے قبل جب حیات یا شعور کا کوئی وجود نہیں ہوتا تو اس
تعلق یہ نہیں کہا گیا کہ وہ تمہیں پہلی مرتبہ زندگی دیتا ہے بلکہ یہ کہا گیا کہ اس حیات سے
تم مردہ تھے۔ کنتم امواتا (تم مردہ تھے) بالفاظ دیگر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں ہمارا

وجود ضرور تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ الفاظ لانے کی ضرورت ہی نہیں تھی براہ راست یہ کہا جاسکتا تھا کہ اللہ نے تم کو پہلی بار پیدا کیا اور حیات دی لیکن ایسا نہیں کہا گیا۔ اور حیات سے پہلے مردہ حالت میں ہی سہی انسانی وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی تناظر میں پتھر والی مثال دوبارہ ذہن میں لائیے پتھر اپنی جگہ موجود تھا یہ انسان کی حیات سے پہلے کی صورتحال ہے جب انسان کو کسی قسم کا کوئی شعور نہ تھا تاہم جب پتھر کو حرکت میں لایا جاتا ہے تو اس کی مخفی توانائی اس کی حرکی توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بعینہ یہی صورتحال حیات انسانی کے ساتھ بھی ہے۔ پتھر کو حرکت میں لانے کے لیے کسی نہ کسی خارجی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے جس سے وہ حرکت میں آسکے لامحالہ یہی صورتحال انسان کے ساتھ بھی ہے اس مردہ انسان کو جس میں کوئی شعور نہیں بالفاظ دیگر کوئی حرکت نہیں اسے حرکت میں لانے کے لیے کسی نہ کسی خارجی ذریعے کی ضرورت ہے۔ پتھر کی صورت میں تو یہ خارجی طاقت کوئی بھی ہو سکتی ہے تاہم انسان کی اس مخفی توانائی کو حرکی توانائی میں بدلنے کا واحد ذریعہ صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے جیسا کہ اس آیت کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے ”اس نے تمہیں زندہ کیا“ بالفاظ دیگر انسان کی مخفی توانائی کو حرکی توانائی میں بدلنے کے لیے جس خارجی ذریعے کی ضرورت ہے وہ صرف اور صرف اللہ کی ذات واحد ہے اس کے علاوہ کسی کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے۔ اور یہ وجود باری تعالیٰ کی بذات خود ایک دلیل بھی ہے۔ اسی طرح جب پتھر حرکت میں آتا ہے تو وہ اپنی حرکی توانائی سے حرکت میں رہتا ہے اور جب کسی بھی وجہ سے اس کی یہ حرکت رک جاتی ہے تو اس کی حرکی توانائی پھر مخفی توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور وہ پھر جمود یا موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کو جب اللہ کی ذات

زندگی دیتی ہے تو وہ حرکت میں آجاتا ہے اور وہ تمام افعال انجام دینے لگتا ہے جو زندگی کا خاصہ تصور ہوتے ہیں۔ تاہم بالکل پتھر کی طرح جو اس وقت تک حرکت میں رہتا ہے تب تک اس پر خارجی قوت اثر انداز ہوتی رہے انسان بھی اسی وقت تک زندہ رہتا ہے تب تک اللہ کی مشیت اسے اس کی اجازت دیتی ہے۔ جب اس کی مشیت چاہتی ہے تو اس کی یہ حرکی توانائی پھر ختم ہو کر جمودہ شکار ہو جاتی ہے جسے انسانی موت کہا جاتا ہے۔ جسے روزِ قیامت پھر دوبارہ اللہ تعالیٰ اسی طرح حرکت میں لے آئے گا جس طرح اس نے پہلی بار حرکت دی تھی۔

لیکن یہاں پتھر کی حرکت اور انسانی حیات یا انسانی حرکات (حرکت کی جمع) میں ایک ایسا فرق ذہن میں رکھا جانا لازمی ہے۔ پتھر کی حرکت کی سمت اور اس کی رفتار کا تعین وہ رجبی قوت کرتی ہے جس کے زیر اثر پتھر حرکت میں آتا ہے اس میں پتھر کا اپنا کوئی اختیار و ارادہ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اس کا کوئی شعور رکھتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف انسانی افعال ہمیشہ شعوری ہوتے ہیں۔

ان شعور اور جسم کے تعلق کے حوالے سے ایک مثال کسی بھی آٹو موبائیل مثلاً کار کی دی جاسکتی ہے۔ کار کا ایک مخصوص ڈھانچہ ہوتا ہے جسے ہم اس کا جسم کہہ سکتے ہیں۔ کار بغیر رهن (پیٹرول یا گیس) کے بغیر نہیں چل سکتی جسے اس کی غذا کہا جاسکتا ہے۔ کار کے تمام افعال اس یوں تو اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں لیکن کار کی حرکت میں اصل کردار اس کی بیٹری انجام دیتی ہے۔ اگر بیٹری سے کرنٹ کی فراہمی جاری ہوگی تو کار حرکت میں آئے گی اور اگر بیٹری سے کرنٹ کی فراہمی میں خلل واقع ہو جائے تو ظاہر ہے کار کی حرکت میں رکاوٹ پیش آئے گی یہ گویا کار کا ”شعور“ ہے جو اسے حرکت میں رکھتا ہے۔

کار کی بیٹری دو اقسام کے کرنٹ کے ملاپ سے چلتی ہے یعنی مثبت اور منفی بالفاظ دیگر انسانی تناظر میں یہ اس کا شعور ہے جو دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ جس طرح مثبت کرنٹ منفی سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے اسی طرح انسان میں بھی انسانی شعور اس کے دوسرے جزو سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ ان دونوں کے ملاپ سے حیات وجود میں آتی ہے اور موت سادہ طور پر ان دونوں اجزاء کی علیحدگی کا نام ہے (تفصیل کے لیے اس باب میں عنوان ”انسانی موت و حیات انسانی شخصیت کے دونوں اجزاء کی علیحدگی اور ملاپ کا نام ہے“) دیکھئے اگر کار سے اس کی بیٹری علیحدہ کی جائے تو اس کا ڈھانچہ باقی رہ جاتا ہے اسی طرح انسانی جسم سے شعور کی علیحدگی کے بعد محض اس کا بھی ڈھانچہ باقی رہ جاتا ہے۔ جس طرح کار سے بیٹری کی علیحدگی کے بعد اس کی حیثیت محض ڈھانچے کے رہ جاتی ہے اور عدم استعمال کی صورت میں وہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جاتی ہے اسی طرح انسانی جسم موت کے بعد ایک خاص مدت میں گل سرخ کر ختم ہو جاتا ہے۔ تاہم کار کے برخلاف انسانی افعال شعوری ہوتے ہیں جبکہ کار کی حیثیت انسانی ہاتھ میں ایک کھلونے کی مانند ہوتی ہے وہ اسے جیسے چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ انسان اپنے تمام افعال اپنے شعور کی روشنی میں انجام دیتا ہے۔

تاہم یہاں ان افعال کو دو (۲) حصوں میں تقسیم کیا جانا ضروری ہے۔ پہلی قسم کے افعال وہ ہوتے ہیں جو شعور کی پہلی سطح یعنی درجہ حیوانیت کے ذیل میں آتے ہیں ان میں جیسا کہ عرض کیا گیا انسان کے جسمانی تقاضوں کی تکمیل کے تحت انجام دی جانے والی سرگرمیاں شامل ہیں جبکہ دوسری قسم کی سرگرمیاں وہ ہوتی ہیں جو اس سطح سے بلند ہو کر کسی متعینہ مقصد کے حصول کی خاطر انسان اپنے ارادے و اختیار کے تحت انجام دیتا ہے۔ یہاں واضح رہے کہ حیوانات کو شعور کی صرف پہلی سطح ملتی ہے جبکہ انسان دونوں سطحوں کا حامل ہوتا ہے۔

کی پہلی سطح پر شعور کے تقاضے صرف جسمانی ضروریات کی تکمیل تک محدود ہوتے ہیں اس سے آگے کچھ سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا لہذا اس سطح پر شعور اور جسم کا تعلق محض (Complementary) ہوتا ہے۔ شعور جسم کے بغیر اور جسم شعور کے بغیر معنی نہیں رکھتا۔

دوسری سطح پر جہاں تک جسمانی ضروریات کی تکمیل کا تعلق ہے یہاں بھی صورتحال ہوتی ہے لیکن چونکہ فہم و تدبیر اور اختیار و ارادہ کی اضافی خصوصیات شعور کو حاصل ہو جاتی ہیں لہذا شعور اب جسمانی تقاضوں پر حاوی ہو جاتا ہے مثلاً شعور کی ابتدائی سطح پر اگر جسم کو لگی ہو تو شعور صرف اور صرف غذا کے حصول کی سعی کرتا ہے لیکن شعور کی بالائی سطح پر بالاتر مقاصد کے حصول کے لیے جسمانی تقاضوں کو ایک حد تک فراموش کر سکتا ہے مثلاً: مسلمان روزہ کی حالت میں شدید جسمانی طلب کے باوجود غذا کا کوئی معمولی معمولی حصہ بھی منہ میں نہیں لیتا۔ ایک بیل اپنی جنسی تقاضوں کی تکمیل کسی بھی گائے سے کرنا ہے لیکن انسانوں کے حوالے سے صورتحال قطعی تبدیل ہو جاتی ہے۔ انسانی شعور ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ لہذا شعور کی بالائی سطح پر انسانی شعور ایک مقصد کے لیے اپنے اختیار و ارادہ کو بروئے کار لاتے ہوئے اول سطح پر ایک بالاتر حیثیت کا حامل ہوتا ہے اس مرحلے پر یقیناً ایسا نہیں ہوتا کہ شعور جسم کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے بلکہ سطح کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے وہ بہر صورت جسم کا محتاج ہوتا ہے لیکن بالاتر مقاصد کے لیے جبکہ ابتدائی تقاضوں کی تکمیل ہو چکی ہو وہ جسم کو استعمال کرتا ہے۔

کے طور پر اگر ایک انسان اپنی زندگی کا کوئی خاص مقصد متعین کرتا ہے اور اس کے

حصول کے لیے جدوجہد بھی کرتا ہے تو ظاہر ہے اس کا یہ مقصد اس کے جسم نے طے نہیں کیا بلکہ یہ اس کی شعوری کوشش تھی اور اس مقصد کے حصول کے لیے جب وہ جدوجہد کرتا ہے تو جسم کے توسط سے ہی کرتا ہے۔ صرف شعور جسم سے علیحدہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ تاہم اس کا جسم سے تعلق شعور کی سطح پر منحصر ہوتا ہے۔ ابتدائی سطح پر یہ جسم کے تقاضوں کا تابع ہوتا ہے تاہم بالائی سطح پر یہ اس پر اختیار کا حامل ہو جاتا ہے۔

انسانی شخصیت کا جزو دوم نفسِ انسانی / نفس

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ از روئے قرآن انسانی شخصیت کا دوسرا حصہ یا جزو انسانی نفس / نفس ہے۔ جہاں تک اس دوسرے حصے کا تعلق ہے یہ انسان کی اپنی رضا سے حاصل کردہ امانت ہے جس پر انسان مکمل دسترس رکھتا ہے۔ یہ امانت نفسِ انسان کو بلا وجہ نہیں دی گئی۔ یہ امانت نفسِ ہر انسان کو مکمل متوازن حالت میں پیدائش کے وقت عطا ہوتی ہے اور روزِ آخرت انسان کی کامیابی اور ناکامیابی کا معیار از روئے قرآن یہی ہے کہ انسان کیا اس کا توازن برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ جو انسان اس امانت کو بعینہ اللہ کے حضور پہچانے میں کامیاب رہا یعنی اس نے اس کا توازن بگڑنے نہیں دیا وہ کامیاب و کامران ہوگا اور جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا یا اس کا توازن بگاڑ دیا وہ ناکام و نامراد ہوگا۔ اس توازن کے قائم رہنے کا بنیادی انحصار رزقِ حلال کے حصول اور اعمالِ صالح پر ہے ان دونوں افعال سے نفسِ انسانی کا توازن برقرار رہتا ہے اور مستحکم ہوتا ہے جبکہ ظلم سے خواہ اس کی نوعیت کسی بھی قسم کی ہو اس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ کوئی بھی ظلم خواہ وہ کتنا بھی معمولی کیوں نہ ہو کسی نہ کسی درجے نفس کے توازن پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ توازن جتنا

یادہ بگڑتا جائے گا آخرت میں کامیابی کے امکانات اتنے ہی کم ہوتے چلے جائیں گے۔
 وجہ سے قرآن مجید میں اہل ایمان کو نفس کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر انسان مسلسل
 سالِ صالح کرتا رہے اور رزقِ جلال پر کاربند رہے تو ایک منزل ایسی آجاتی ہے جہاں
 انسان اپنے رب سے اور اس کا رب اپنے بندے سے راضی ہو جاتا ہے یہ منزل قرآن کی
 اصطلاح میں نفسِ مطمئنہ کہلاتی ہے۔ جو کامیابی کی منزل ہے بالفاظِ دیگر انسانی زندگی کا منتہا
 صود ہے۔

ماں تک انسانی شخصیت کے اس دوسرے جزو یعنی نفسِ انسانی کا تعلق ہے اس حوالے سے
 درجہ ذیل نکات کو ذہن میں رکھنا لازمی ہے:

۱۔ نفس، انسان کی اپنے اختیار سے حاصل کردہ امانت ہے۔

۲۔ انسان اپنے نفس پر مکمل قدرت رکھتا ہے۔

۳۔ نفس انسانوں کو مکمل متوازن حالت میں عطا ہوتا ہے۔

۴۔ انسانی زندگی کا مقصد اس کے توازن کو برقرار رکھنا ہے۔

۵۔ انسان صرف اپنے نفس کا ذمہ دار ہے۔

۶۔ صرف مسلمانوں کو نفس کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔

۷۔ نفس بنیادی طور پر آزمائش کا ذریعہ ہے۔

۸۔ کسی نفسِ انسانی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کیا جاتا۔

۹۔ آزمائش میں کامیابی کی صورت میں نفسِ مطمئنہ کی سطح حاصل ہوتی ہے۔

۱۰۔ انسانی موت و حیات انسانی شخصیت کے انہی دونوں اجزاء کی علیحدگی اور ملاپ کا نام ہے۔

۱۱۔ موت کے وقت فرشتہء اجل انسانی شخصیت کے دونوں اجزاء پر قبضہ کر لیتا ہے۔

۱۲۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور

۱۳۔ کوئی نفس اللہ کے اذن کے بغیر مر نہیں سکتا۔

ان نکات کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ نفس انسان کی اپنے اختیار سے حاصل کر وہ امانت ہے:

جہاں تک انسانی شخصیت کے دو اجزاء میں سے دوسرے حصے یعنی نفس انسانی کا تعلق ہے یہ امانت انسان نے خود اپنے اختیار سے حاصل کی ہے۔ اس امر کی شہادت سورۃ احزاب کی مندرجہ ذیل آیت ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا
وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ○ (۳۳/۷۲)

ہم نے بار امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو پیش کیا تو انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

اس آیہ کریمہ میں جس بار امانت کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ سوائے نفس انسانی کے اور کچھ بھی نہیں۔ اس حوالے سے سادہ سی دلیل یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں الحمد سے لیکر والناس تک انسانوں کو صرف ایک شے کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے اور وہ نفس ہے۔ پورے قرآن مجید میں کہیں بھی کسی بھی مقام پر بلا واسطہ یا بالواسطہ انسانوں کو ماسوا نفس کسی بھی شے کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا گیا ہے لہذا انسانوں کے حوالے جس امانت کا تذکرہ متذکرہ بالا آیت میں کیا گیا ہے وہ ماسوا نفس انسانی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس دعویٰ کو تقویت اس امر سے بھی ملتی ہے کہ روز قیامت انسان کی کامیابی یا ناکامیابی کا

معیار اس امر پر ہوگا کہ یہ نفس جو انسان کو قطعی متوازن حالت میں عطا کیا جاتا ہے انسان کس حد تک اس کے توازن کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہا ہے؟ یہی اسکی کامیابی یا ناکامیابی کا معیار ہوگا۔ اس امر کو مزید تقویت اس آیت (۲۳/۷۲) میں بیان کردہ دو انسانی خصوصیات سے بھی ملتی ہے۔ اس آیت میں انسان کو ظالم اور جاہل قرار دیا گیا ہے۔ ظلم سے مراد اللہ کی متعین کردہ حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ انسان بار بار یہ فعل کرتا ہے یعنی حکام الہی کی خلاف ورزی۔ اس فعل کا اثر از روئے قرآن انسان کے نفس پر ہی پڑتا ہے۔

قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا سَاءً وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا

وَتَرْحِمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ (۷۲/۲۳)

ان دونوں نے کہا! اے ہمارے رب! ہم نے اپنے نفوس پر ظلم کیا اگر تو ہم کو نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

صرف متذکرہ بالا آیات بلکہ قرآن مجید سے اس حوالے سے کئی آیات پیش کی جاسکتی ہیں جہاں قطعی واضح اور دو ٹوک انداز میں کسی بھی نوعیت کے ظلم کا اثر انسانی نفس پر ہی بتایا گیا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے تیسرا باب) اس امر سے بھی اس مفروضے کو تقویت ملتی ہے کہ جس امانت کا تذکرہ (۷۲/۳۳) میں کیا گیا ہے وہ انسانی نفس ہی ہے کیونکہ انسان ہی اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔

اس حوالے سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس آیت (۷۲/۳۳) میں اس انسان کو جاہل اور دیا گیا ہے۔ جاہل کا مادہ جھل ہے۔ اس کے معنی ہیں غیر واضح امور کی واقفیت حاصل کیے بغیر ان کی جانب پیش قدمی کرنا۔ جہل کی مختلف اقسام بیان کی جاتی ہیں مثلاً (خالی الذہن ہونا) (۲) کسی بات کی بابت اس کی صحیح کیفیت کے خلاف اعتماد رکھنا

اور (۳) کسی کام کو اس کے صحیح طریقے کے خلاف کرنا خواہ اعتقاد اس حوالے سے صحیح ہو یا غلط۔ (۴) ناواقفیت اور (۵) حلم اور برداشت کی قوتوں سے محرومی (۶) علم کی ضد۔ انسان اس حوالے سے آخر الذکر تین حوالوں سے جاہل قرار پاتا ہے۔ نفس جسے متوازن حالت میں انسانوں کو عطا کیا جاتا ہے اور اس کے توازن کی ذمے داری خود انسان نے لی اور وہ اس کے توازن کو برقرار نہیں رکھتا اور اکثر و بیشتر حلم و برداشت کی قوتوں سے محروم ہو کر اپنے جاہل (علم کی ضد) کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔ اور بڑی حد تک اس نے نفس کی امانت کو قبول کرتے وقت اس حوالے سے بھی جاہل کا مظاہرہ کیا کہ یہ دیکھے بغیر کہ اس امانت کو واپس اللہ تک پہنچانے میں کس قدر جگر پاش مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا اس نے اسے قبول کر لیا اور نفس کے توازن کو برقرار رکھنے کے جو طریقے خود قادرِ مطلق نے اسے بتائے ہیں وہ ان کی خلاف ورزی علم نہ رکھنے کی وجہ سے کرتا رہتا ہے۔

اس مفروضے کے حوالے سے کہ آیت (۳۳/۷۲) میں بارِ امانت سے مراد انسانی نفس ہی ہے اس آیت سے بالکل متصل اگلی آیت بھی پیش کی جاسکتی ہے جہاں ارشادِ باری ہے۔

لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ
وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ
وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا

(۳۳/۷۳)

تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں، مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور خدا مومن مردوں اور مومن عورتوں پر مہربانی کرے اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

آیت بھی اس امر پر شاہد ہے کہ بارِ امانت سے مراد نفسِ انسانی ہی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مومن مرد اور عورت چونکہ اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں اور وہ اپنے نفس کے اذن کی برقراری کے لیے تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں لہذا وہ اس امانت کو اس کے لک کے پاس بہ حسن و خوبی پہنچا سکتے ہیں اور یہ راہ چونکہ کوئی آسان راہ نہیں ہے موانعات سے پر ہے لہذا وہ لوگ جو اس راہِ خارزار سے باکمال و خوبی گذرتے ہیں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ اپنے رب سے اس کا اجر حاصل کریں گے۔ اور منافقین اور مشرکین (واضح رہے کہ قرآن کریم نے بعض مقامات پر کفار کو مشرک بھی کہا ہے اور مشرکین کو کفار بھی لہذا اس مرے میں کفار بھی شامل ہیں) چونکہ دنیا ہی کو سب کچھ مان لیتے ہیں لہذا وہ اس امانت سے اس حد تک خیانت کر چکے ہوتے ہیں کہ خود ہی اپنے اعمال کی وجہ سے عذاب کے حقدار بن جاتے ہیں لہذا دونوں آیات (۳۳/۷۲) اور (۳۳/۷۳) ایک ہی مضمون کی تکمیل کر رہی ہیں۔ پہلی آیت میں امانت کی حوالگی اور دوسری آیت میں اس امانتِ نفس کے توازن حالت میں پہنچانے پر انعام اور بصورتِ دیگر نفس کے غارت کرنے پر سزا کی بات لائی گئی ہے۔ لہذا اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بارِ امانت سے مراد نفس کی امانت ہی ہے۔

ہاں تک اس آیت کے حوالے سے بیشتر مفسرین کرام کی اس رائے کا تعلق ہے کہ اس بارِ امانت سے مراد شریعت کے احکام و فرائض ہیں جن کی ادائیگی پر ثواب اور اعراض و انکار پر عتاب ہوگا اس لیے قابلِ قبول نہیں کہ اس آیت میں خطاب مسلمانوں / مومنین سے نہیں ہے۔ تمام نوعِ انسانی سے ہے۔ احکامِ شریعت کی پابندی صرف مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ مسلمانوں پر نہیں۔ اگر اس آیت میں امانت سے مراد صرف احکامِ شریعت ہوتے تو خطاب مسلمانوں / مومنین سے ہونا چاہیے تھا پوری نوعِ انسانی سے نہیں۔

دوسری طرف یہ امر بھی ذہن میں رکھیے کہ آسمان، زمین اور پہاڑ جن کو یہ امانت پیش کی گئی وہ تو پہلے ہی کمالِ اطاعت پر ہیں وہ اپنے خالق کے احکامات کی خلاف ورزی کا کوئی تصور ہی نہیں رکھتے لہذا ان کے متعلق یہ تصور کرنا کہ انہوں نے احکامِ خداوندی کی اطاعت سے انکار کر دیا ویسے ہی ناممکن ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ نفس کی دولت تمام انسانوں کو بالکل یکساں انداز میں عطا کی جاتی ہے اس میں کسی قسم کی کوئی استثناء نہیں ہے اور اس آیت میں بیان بھی نوعِ انسانی کا ہو رہا ہے لہذا ابارِ امانت سے مراد صرف اور صرف نفس کی دولت ہے۔

اس حوالے سے ایک استدلال غلام احمد پرویز صاحب کا بھی ہے۔ پرویز صاحب اس آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ”ہم نے امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس (خیانت) سے ڈر گئے لیکن انسان اس میں خیانت کرتا ہے۔ یہ بڑا ہی ظالم اور نادان ہے۔“ اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں ”یعنی خدا نے اپنے قوانین کی اطاعت کی امانت کو خارجی کائنات کے سپرد کیا تو اس نے اسمیں کسی قسم کی خیانت نہیں کی۔ تمام اشیاء کائنات اپنے فرائضِ مخصوصہ کی تکمیل میں سرگرداں رہتی ہیں۔ لیکن یہی قانون جب انسان کو دیا تو یہ اسمیں خیانت کرتا ہے۔ اسکی اطاعت نہیں کرتا یہ بڑا نادان ہے اور اپنے آپ پر زیادتی کرتا ہے۔“ (غلام احمد

پرویز، لغات القرآن۔ ج ۲، دسمبر ۱۹۸۷ء طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور ص ۵۵۲۔

(۵۵۳) یہ استدلال کہیں سے بھی عقل و فکر کے ادنیٰ سے ادنیٰ معیار پر بھی پورا نہیں اترتا

کیونکہ:

(۱) پرویز صاحب اس آیت کا جو ترجمہ کرتے ہیں اس پر غور کیجئے ان کے اپنے الفاظ

یہ ہیں ”ہم نے امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا“۔ بالفاظ دیگر نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ نے خود اس امانت میں خیانت کرنے کو خارجی کائنات کو کہا اور انہوں نے اس میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا خود سوچئے اس سے اللہ تعالیٰ کے متعلق کس قسم کا تصور ابھرتا ہے جو ایک طرف پورے قرآن میں امانت کی حفاظت کی تاکید کرتا ہے اور دوسری طرف خود اپنی امانت خارجی کائنات کو خیانت کے لیے پیش کرتا ہے؟ اس میں بھی طرفہ تماشہ یہ ہے کہ خارجی کائنات ایسا کرنے سے انکار کر دیتی ہے اس کے بعد خود خدا کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے؟

ماہر ہے اللہ کی ذات ان انسانی فکری لغزشوں سے ماورا ہے وہ ایک مکمل اور کامل ہستی ہے اس سے کوئی تضاد منسوب نہیں ہو سکتا۔ یہ تصور بھی گناہ ہے۔ لہذا یہ استدلال بھی قطعی محل نظر

اس ترجمے کی وضاحت میں کہتے ہیں ”خدا نے اپنے قوانین کی اطاعت کی امانت کو خارجی کائنات کے سپرد کیا۔“ یہ جملہ بجائے خود منطقی لحاظ سے ایک مکمل بے ربط ہے۔ ”قوانین کی اطاعت کی امانت“ چہ معنی دارو؟ اطاعت کا حکم دیا جاتا ہے اس کی اطاعت پیش نہیں کی جاتی۔

بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ امانت سے مراد قوانین خداوندی کی اطاعت کی امانت ہے صحیح ہے۔

انسان اپنے نفس پر مکمل قدرت رکھتا ہے:

قرآن انسان اپنے نفس پر مکمل قدرت رکھتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ انسان

کو اس نفس پر مکمل قدرت حاصل ہے جو اس نے اپنے مرضی سے بطور امانت قبول کیا ہے۔ اس حقیقت کا اثبات اس آیت قرآنی سے ہوتا ہے۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَإِنِّي فَاقِرٌ

(۵/۲۵)

بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ○

موسیٰ نے کہا اے میرے رب! میں اپنے نفس کے سوا اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر ہرگز گرفت نہیں رکھتا اس لیے تو ہمارے اور فاسقین کے درمیان امتیاز کر دے۔

اس آیت کریمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ الفاظ کہ میں اپنے نفس اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر گرفت نہیں رکھتا اس امر کی کھلی کھلی شہادت ہیں کہ انسان اپنے نفس پر مکمل گرفت رکھتا ہے۔ یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ نفس پر قدرت کے لیے آیت مذکورہ میں لفظ اَمْلِكُ استعمال کیا گیا ہے جس کا مادہ م ل ک ہے اس کے بنیادی معنی قوت رکھنا، کسی چیز پر قادر ہو جانا، اختیار رکھنا، اتھارٹی (Authority) کے ہوتے ہیں۔ ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اس کے معنی سہارا کے بھی ہوتے ہیں جس پر کوئی چیز قائم ہو۔ اس کے معنی قوت اور شدت کے بھی آتے ہیں۔ مالک کے معنی صاحب اختیار و اردہ کے ہیں۔ اس کے علاوہ مالک وہ مقصور ہوتا ہے جس کے تابع کوئی دوسرا ہو جائے (۳۶/۷۲)۔ (۲/۲۲۷) میں ملک کو اقتدار و اختیار کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح ملکوت کے معنی عزت و اقتدار کے ہیں لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے لیے مخصوص ہے کہ پوری کائنات کا وہی یکہ و تنہا مکمل مالک ہے اور اس پر مکمل اختیار و اردہ رکھتا ہے۔

ریحیات بالا سے واضح ہے کہ ملک کا لفظ قرآن مجید میں اختیار و قبضہ و قدرت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور جب نفس انسانی کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جائے تو اس کا واضح مطلب ہے کہ انسان کو اپنے نفس پر مکمل قبضہ و اختیار حاصل ہے۔

یہاں بطور اعتراض یہ دلیل دی جائے متذکرہ بالا آیت (۵/۲۵) کے الفاظ حضرت یونسؑ کے ہیں اور اس سے انبیاء کی حد تک تو ثابت ہوتا ہے عام لوگوں کے لیے کلیہ مستحب کیا جاسکتا۔ تاہم ایسا نہیں ہے یہ صورت حال نہ صرف انبیاء و رسل کے حوالے سے بلکہ تمام نوع انسان کے حوالے سے بھی ہے اس کی تصدیق سورۃ آل عمران کی مندرجہ آیت سے ہوتی ہے۔

كُتِبَ لَكُمْ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ

(۳/۱۸۶)

تمہیں تمہارے اموال اور تمہارے نفوس کے متعلق ضرور آزمایا جائے گا۔

ت کے یہ الفاظ واضح اور صریح انداز میں پوری نوع انسانی کے متعلق ایک کلیہ بیان ہے ہیں اور کلیہ یہ ہے کہ تمہیں (تمام نوع انسانی کو کیونکہ یہاں خطاب کسی خاص گروہ کے لیے نہیں ہے) مثلاً مسلمانوں، کفار یا مشرکین وغیرہ سے نہیں ہے) تمہارے اموال اور نفوس کے متعلق ضرور آزمایا جائے گا۔ یہاں آزمائش سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت اسی باب میں ان ”نفس انسانی ذریعہ آزمائش“ کے تحت آگے کی گئی ہے۔ فی الوقت زیر غور نکتہ یہ ہے کہ پوری نوع انسانی کو یہ پیغام دیا جا رہا ہے کہ تمہیں تمہارے اموال اور نفوس کے متعلق آزمایا جائے گا۔ آزمائش ظاہر ہے اسی وقت ہو سکتی ہو جب کسی چیز پر قبضہ حاصل ہو اور اس کے متعلق جانچا جائے کہ انسان اپنے زیر تصرف شے کو کیسے

استعمال کرتا ہے؟ اگر کسی شے پر انسانی قبضہ و اختیار ہی نہ ہو تو اس کے متعلق جانچ یا آزمائش کا تصور ہی بے معنی ہے لہذا انسان کو اس کے نفس پر مکمل قبضہ و اختیار دیا گیا ہے جیسا کہ آزمائش کا پہلو سامنے آسکتا ہے ورنہ نہیں۔

اس حوالے سے ایک اور اہم نکتہ یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ متذکرہ بالا آیت (۱۸۶/۳) میں آزمائش کے بابت بیان دو حوالوں سے ہے ایک مال اور دوسرا نفس۔ اپنے مال پر ظاہر ہے انسان کو مکمل قبضہ و اختیار حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں چھبیس (۸۶) مختلف مقامات پر مختلف حوالوں سے مختلف چیزوں پر انسانی ملکیت تسلیم کی گئی ہے اور مال پر انسانی قبضہ و اختیار کا حق ایک بدیہی حقیقت ہے جسے کوئی بھی چیلنج نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف اس آیت میں مال کے ساتھ انسانی نفس کا تذکرہ کر کے اس حقیقت کو مزید واضح کر دیا گیا ہے کہ جس طرح مال پر انسانی قبضہ ایک امر صریح ہے بعینہ نفس پر انسانی اختیار بھی روز روشن کی طرح ایک عیاں حقیقت ہے۔

اس امر کی مزید تصدیق سورۃ المائدہ کی مندرجہ ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسُكُمْ

(۵/۱۰۵)

اے اہل ایمان! اپنے نفس کی حفاظت کرو۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کا اہل ایمان سے مطالبہ ہے کہ اپنے نفس کی حفاظت کرو یہاں نقطہ تدریج یہ ہے کہ حفاظت کا مطالبہ کس سے کیا جاتا ہے؟ ظاہر ہے حفاظت کی توقع اسی سے کی جاتی ہے جس کو کسی شے پر قبضہ و اختیار دیا جائے۔ اگر کوئی شے انسانی اختیار میں ہی نہیں ہو تو اس کی حفاظت کا مطالبہ ایک بے معنی امر ہوگا۔ لہذا نفس کو انسانی اختیار میں دینے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس حفاظت کریں۔

اسی تناظر میں سورۃ النساء کی مندرجہ ذیل آیت بھی اہمیت کی حامل ہے۔

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، لَا تُكَلِّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِيضَ

الْمُؤْمِنِينَ،

(۲/۸۴)

تو تم اللہ کی راہ میں لڑو تم اپنے نفس کے سوا کسی کے ذمے دار نہیں ہو اور مؤمنین کو

بھی ترغیب دو۔

یہاں بھی ظاہر ہے نفس کی ذمے داری انسان پر ڈالی گئی ہے بالفاظ دیگر نفس کو انسان کی

ویل میں دیا گیا ہے اور انسان کو اس کا مکلف قرار دیا گیا ہے۔ اسی حوالے سے

سورۃ الانعام کی مندرجہ ذیل آیت پر بھی تدبر لازمی ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ

وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ، أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ

(۶/۹۳)

اور کاش تم ان ظالم لوگوں کو اس وقت دیکھو جب وہ موت کی سختیوں میں ہوں اور

ملائکہ (یہ کہتے ہوئے) ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنے نفوس۔

اس آیت کریمہ میں جہاں ظالمین کا موت کے وقت انجام بتایا گیا ہے وہیں قابل غور

ورت حال یہ ہے کہ ملائکہ ظالمین سے یہ کہہ رہے ہیں کہ اخرجوا انفسکم (نکالو اپنے

نفس) یہاں ظاہر ہے حکم ظالمین کو دیا جا رہا ہے کہ اپنے نفوس نکالو یہ الفاظ اس امر پر صریح

دلیل کرتے ہیں کہ انسانوں کا نفس پر قبضہ ہوتا ہے جیسا کہ ملائکہ انسانوں سے مطالبہ کرتے

ہیں کہ ”نکالو اپنے نفوس“ ورنہ اگر انسانوں کا نفس پر قبضہ اختیار نہ ہو تو ظاہر ہے کہ ملائکہ کس

یاد پر انسانوں سے اس قسم کا مطالبہ کر سکتے ہیں؟

اس پر انسانی قبضہ و اختیار کے حوالے سے سورۃ نازعات کی مندرجہ ذیل آیت بھی اہمیت کی

حامل ہے۔

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ (۷۹/۴۰)

جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اور اپنے نفس کو (گری ہوئی) خواہشات سے روکا۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے روز قیامت کا میاں بی کے لیے درکار مختلف شرائط میں سے ایک شرط بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہی شخص جنت کا حقدار ہوگا جو دنیاوی زندگی میں اپنے آپ کو نفس کی گری ہوئی خواہشات کی تکمیل سے روکتا رہا۔ موضوع زیر بحث کے لحاظ سے مقام تدبیر یہ ہے کہ انسان کے پاس اتنا ارادہ و اختیار ہے جس کی مدد سے وہ اپنے نفس کو اپنے قابو میں رکھ سکتا ہے اور اس کی منفی ترغیبات پر حاوی ہو سکتا ہے۔ یہ امر پھر اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کو نفس پر قبضہ و قدرت حاصل ہے۔

قبضہ و قدرت لامحالہ ارادہ و اختیار پر منتج ہوتا ہے لہذا اس بحث سے ایک اور نتیجہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ انسانوں کو مکمل اختیار و ارادہ کی صلاحیت دی گئی ہے۔ اگر انسان کے پاس اختیار و ارادہ کی نعمت نہ ہوتی تو اس سے نفس کی حفاظت کا مطالبہ بھی نہیں کیا جاتا۔ جو اصحاب انسانی اختیار و ارادہ کے حوالے سے اس بحث میں دلچسپی رکھتے ہوں وہ میری کتاب ”رزق کی بست و کشاد کے قرآنی قوانین“ کا مطالعہ کر سکتے ہیں جہاں اس حوالے سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

۳۔ انسانوں کو نفس متوازن حالت میں عطا ہوتا ہے

ازروئے قرآن انسانوں کو نفس متوازن حالت میں عطا ہوتا ہے اس حقیقت کی گواہی قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے ملتی ہے۔

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝

(۹۱/۷)

اور انسانی نفس کو بھی اور اس کے توازن کو بھی (شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں)

آیت کریمہ میں سوہا کا لفظ تدبر کا طالب ہے اس کا مادہ س وی ہے۔ اس کے معنی ہیں
 ی شے کا اپنی ذات میں مکمل اعتدال۔ اس کے معنی میں استقامت اور دو چیزوں کے
 اعتدال بھی شامل ہیں۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس لفظ کو انہی معنوں میں
 استعمال کیا گیا ہے مثلاً ولما بلغ أشده واستوى (۲۸/۱۲) ”اور جب جوانی کو پہنچا اور مکمل
 ن ہو گیا“ اسی طرح سورۃ الفتح آیت ۲۹ میں اسے مضبوطی اور سیدھے کھڑے ہونے کے
 میں استعمال کیا گیا ہے۔ فاستوی علی سوقہ ”پودوں کا مضبوط ہو کر تنوں پر سیدھا کھڑا
 بانا“۔ اس کے معنوں میں ہر قسم کی افراط و تفریط سے محفوظ رہنا بھی ہے۔ اعتدال کی راہ
 معنوں میں اسے سورۃ طہ میں استعمال کیا گیا ہے الصراط السوی (۲۰/۱۳۵) سیدھی راہ یا
 ال کی راہ۔ انہی معنوں میں اسے سورۃ المریم میں ان الفاظ کیساتھ بیان کیا گیا ہے فتعمل
 بشر اسویا (۱۹/۱۷) ”وہ اس کے سامنے کامل بشر کی صورت میں آیا“۔ سورۃ الملک آیت
 میں بھی اسے سیدھے راستے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ سویا علی صراط مستقیم
 (۶۷/۲) ”جو سیدھا راہ راست پر چلا ہو“۔

مادہ کے معنی وسط اور درمیان کے بھی آتے ہیں ان معنوں میں اسے سورۃ الصافات میں
 استعمال کیا گیا ہے سواء الجحیم (۳۷/۵۴) ”جہنم کا عین وسط“۔ سورۃ النجم میں حضرت
 نبیل علیہ السلام کے متعلق ارشادِ ربانی ہے

(۵۳/۶) ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ

جو زور آور ہے پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اس کے معنی دو چیزوں کے باہم دگر برابر ہونے، ایک دوسرے کی مانند یا مثل اور نظیر ہونے کے بھی ہیں۔ تصریحات بالا سے واضح ہے کہ اس مادے کے بنیادی معنی اعتدال اور توازن کے ہیں اور جس شے کے توازن کی گواہی خود اللہ نے دی ہو تو اس کے بعد اس حوالے سے شک کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا۔

اس امر کی شہادت قرآن مجید میں دیگر مقامات پر بھی دی گئی ہے، مثلاً:

(۹۵/۴) لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ

ہم نے انسان کو انسب توازن کے ساتھ پیدا کیا۔

اس آیت میں تقویم کے لفظ پر تدبر لازمی ہے اس کا مادہ ق و م ہے اس کے معنی متوازن ہونا، کسی معاملت کا توازن یا اعتدال پر ہونا، محکم و استوار ہونا، ثابت اور دائم رہنا، درست اور سیدھا ہونے کے ہیں۔ اس مادے کے تمام الفاظ میں توازن قائم رکھنا مشترک ہے۔ یہ توازن جسمانی، نفسیاتی، معاشرتی، معاشی کسی بھی نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ لہذا جب انسان کے لیے یہ کہا گیا کہ اسے احسن تقویم میں پیدا کیا گیا تو اس سے مراد ہے انسب توازن۔ اس امر کی مزید تصدیق سورۃ الانفطار کی مندرجہ ذیل آیات سے بھی ہوتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّبَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ

الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ

فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ

(۸۲/۶-۸)

اے انسان تجھے اپنے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکہ دیا جس نے
تجھے خلق کیا پھر (تیرے اعضا کو) ٹھیک کیا اور تیرے اخلاط و عناصر میں عمدہ
توازن اور اعتدال پیدا کیا۔

قرآن مجید کی متذکرہ بالا تمام آیات اس امر پر شاہد ہیں کہ خالق دو جہاں نے انسان کو
احسن تقویم کیساتھ خلق کیا ہے اس تقویم میں اس کا جسمانی اور نفسیاتی توازن دونوں شامل
ہیں۔ اس تناظر میں متذکرہ بالا آیت (۹۱/۷) کا مفہوم قطعی واضح ہو جاتا ہے جس میں اللہ
تعالیٰ نے خود نفس کے توازن کو شہادت کے طور پر پیش کرنے کی بات ہے۔ اس سے واضح
ہے کہ انسان کو نفس انتہائی متوازن حالت میں عطا ہوتا ہے۔

۴۔ انسانی زندگی کا مقصد نفس کے توازن کو برقرار رکھنا ہے:

از روئے قرآن انسانی زندگی کا مقصد انسان کو عطا کیئے جانے والے اسی نفس کے توازن کو
برقرار رکھنا ہے جو شخص اس توازن کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو اوہی روز حشر کامیاب و
کامران ہوگا اور جس نے اس توازن کو برباد کر دیا وہ ناکام و نامراد ہوگا۔ بالفاظ دیگر اخروی
کامیابی یا ناکامی کا معیار یہی ہے کہ انسان کس حد تک اپنے نفس کے توازن کو برقرار
رکھتا ہے۔ اس امر کی شہادت قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے ملتی ہے۔

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝

فَالهَمَّهَا فَجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۝

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۝

(۹۱/۷-۹۱/۸)

اور انسانی نفس کو اور اس کے توازن کو بھی (شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں)

پھر اس کو (یہ صلاحیت بھی دی کہ) وہ چاہے تو اپنے اندر انتشار پیدا کر لے یا تقویٰ کی راہ اختیار کرے جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی وہ کامیاب رہا اور جس نے اسے منتشر کر دیا وہ ناکام رہا۔

قرآن مجید کی متذکرہ بالا آیات میں معنی کا ایک پورا جہاں آباد ہے۔ ان آیات کے مختلف الفاظ پر تدبر لازمی ہے۔ جہاں تک اس حوالے سے پہلی آیت (۹۱/۷) کا تعلق ہے اس پر بحث کی جا چکی ہے کہ انسان کو نفس ایک متوازن حالت میں عطا ہوتا ہے۔ اس سے متصل آیت میں ارشادِ ربانی ہے کہ انسان کو یہ صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ چاہے تو فجور (تشت و انتشار) یا تقویٰ دونوں راہوں میں سے کوئی ایک منتخب کر لے۔

اس حوالے سے آیت (۹۱/۸) کے تینوں الفاظ یعنی ^{فلھمھا} فحورھا اور تقوھا خصوصی تدبر چاہتے ہیں۔ اول الذکر لفظ ^{فلھمھا} کا مادہ لہم ہے اس کے معنی کسی شے کو یکبارگی نکل لینے کے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اس انداز میں ہوئی ہے کہ وہ دونوں ممکنات کا حامل ہے۔ بالفاظِ دیگر انسانی ذات میں یہ دونوں ممکنات رکھ دیئے گئے ہیں اب یہ انسان کا اپنا اختیار و ارادہ ہے کہ وہ ان ممکنات یا مضمروقوتوں کو کس راہ کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جہاں تک راہ یا راہوں کا تعلق ہے تو آیت کے اگلے الفاظ واضح طور پر ان راہوں کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ پہلی راہ فجور کی راہ ہے۔ فجور کا مادہ فوج رہے جس کے معنی پھاڑنے اور شق کر دینے کے ہوتے ہیں اس کے علاوہ اس میں کسی خاص جانب جھکنے کا رجحان بھی ہوتا ہے۔ مزید برآں اس کے معنی کشادگی اور کھلے پن کے بھی ہیں۔ راہِ حق سے ہٹ جانے والے کو فاسق و فاجر کہا جاتا ہے۔ انسانی نفس کے حوالے سے اس کے معنی منتشر ہو جانے کے ہوں گے۔ درحقیقت راہِ ہدایت یا راہِ حق سے ہٹ جانے کے نتیجے میں انسانی ذات میں تشت و انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متذکرہ بالا آیت (۹۱/۸) میں فجورھا

کے مقابل تقوٰہا آیا ہے جس کے معنی ہیں انسانی ذات کا تشت و انتشار سے محفوظ رہنا۔ دونوں الفاظ فجو رہا اور تقوٰہا کی ”ہا“ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ دونوں نفس کی کیفیات ہیں۔ بالفاظ دیگر انسانی ذات میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ چاہے تو وہ اپنے آپ کو بگاڑ لے یا مستحکم کر لے۔

اور اس سے متصل اگلی دو آیات میں واضح طور پر اس امر کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ روزِ آخرت یہی کامیابی اور ناکامیابی کا معیار بھی ہے آیت (۹۱/۱۰) میں کہا گیا کہ جس شخص نے اسے (نفس) کو نشوونما دی، اسے بڑھایا وہ کامیاب ہے۔ اس آیت میں زکھا کا لفظ توجہ طلب ہے جس کا مادہ زک و ہے اس کے بنیادی معنی نشوونما پانا، بڑھنا اور پھلنا پھولنا ہیں۔ اس میں بالیدگی اور ارتقاء کا پہلو مضمحل ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر جس نے اپنے نفس کو بالیدگی، نشوونما دی وہ کامیاب ہوگا۔ اس نشوونما کا واحد راستہ ایمان اور اعمالِ صالحہ ہیں۔ جبکہ دوسری طرف جس شخص نے اپنی ذات کو منتشر کر دیا وہ ناکامیاب و نامراد ہوگا اس کی صراحت (۹۱/۱۱) میں دسھا کے لفظ سے کر دی گئی ہے۔ اس کا مادہ دس س ہے جس کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کو کسی دوسری شے کے نیچے چھپا دینا، دبا دینا یا دفن کر دینا۔ قرآن مجید نے کھیتی (الفتح) کی مثال سے صورتِ حال کو واضح کیا ہے۔ کھیتی سے پیداوار کے حصول کے لیے بیج کو زمین میں ملانا پڑتا ہے تاہم اگر بیج سے پودے اور بالآخر تناور درخت بننے کے لیے مقتضیات کی مناسب تکمیل ہو تو بیج بتدریج تناور درخت بن جاتا ہے۔ لیکن اگر صورتِ حال برعکس ہو جائے تو بیج کی تمام صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال انسانوں کے ساتھ ہے۔ انسانی نفس کی نشوونما ایمان اور اعمالِ صالحہ سے ہوتی ہے جبکہ ان دونوں کی عدم موجودگی میں نفس تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اور نفس کی تباہی کا

مطلب روزِ قیامت جہنم کا ایندھن بننا ہے اس سے ماسوا کچھ نہیں۔

۵۔ انسان صرف اپنے نفس کا ذمے دار ہے:

از روئے قرآن ہر انسان صرف اور صرف اپنے نفس کا ذمے دار ہے۔ بالفاظ دیگر نفس کے توازن کی برقراری اور اس کی ترقی ہر انسان کی انفرادی ذمہ داری ہے اور وہ اپنے نفس کی حد تک اس کا ذمے دار ہے اس سے ماسوا نہیں اس کی شہادت قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے ملتی ہے۔

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، لَا تُكَلِّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ

الْمُؤْمِنِينَ، عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ

وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ۝ (۴/۸۴)

سو (اے رسول) اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور تم پر اپنے نفس کے سوا کوئی ذمے داری نہیں اور مومنوں کو بھی ترغیب دلاتے رہو تو قہر ہے کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے گا۔

اس آیت میں واضح طور پر نبی اکرم (ﷺ) کو کہا گیا ہے کہ آپ اپنے نفس کے علاوہ کسی شے کے ذمے دار نہیں ہیں۔ بالفاظ دیگر ماسوا اپنے نفس کے آپ (ﷺ) کسی ذمے داری کے مکلف نہیں ہیں۔ ظاہر ہے جو حکم نبی کے لیے ہے وہ تمام مسلمانوں کے لیے بھی ہے ماسوا اس کے کہ قرآن مجید میں اس کے لیے کوئی تخصیص نہ کی گئی ہو اور اس حکم کے لیے پورے قرآن مجید میں کہیں بھی استثناء نہیں دی گئی لہذا بدیہی طور پر تمام مسلمانوں پر ماسوا ان کے نفس کے کوئی ذمے داری نہیں۔ بلکہ اگر قرآن مجید کی مجموعی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے تو توحید پر اصرار کے بعد جس امر پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ ہر انسان

اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہے۔ اس حوالے سے کئی آیات قرآنی پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً:

(۷۴/۳۸)

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ

ہر نفس اپنے اعمال کے عوض گروی ہے۔

سورۃ توبہ میں ارشادِ باری ہے:

(۹/۸۲)

جَزَاءٌ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

سورۃ سبأ میں ارشادِ باری ہے:

(۳۲/۳۳)

هَلْ يُجْزَوْنَ الْاِمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ

پس جو عمل وہ کرتے تھے انہی کا ان کو بدلہ ملے گا۔

اس کے علاوہ اس ضمن میں کئی آیات کے حوالے دیے جاسکتے ہیں مثلاً: (۴/۱۲۳)،

(۹/۵۵)، (۱۴/۵۱)، (۹۷-۹۶/۱۶)، (۱۷/۱۷)، (۲۰/۱۷)، (۷/۱۲۷)، (۵۲/۱۶)،

(۵۶/۲۲)، (۸۳/۳۶)، (۲۲/۳۰)، (۱۶/۳۲)، (۳/۱۸۲)، (۱۰/۳۰)،

(۲۲/۹-۱۰)، (۳۰/۳۶)، (۲۲/۲۹) اور (۷۳/۳۰) وغیرہ۔

ان آیات کریمہ میں قطعی واضح اور دو ٹوک انداز میں انسان کو اس کے اعمال کا مکلف ٹھہرایا گیا

ہے اور جب از روئے قرآن تمام انسانی اعمال کا اثر اس کے نفس پر مرتب ہوتا ہے تو لامحالہ یہ نتیجہ

اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہر انسان صرف اور صرف اپنے نفس کا ذمے دار ہے اس سے ماسوا نہیں۔

۶۔ اہل ایمان کو نفس کی حفاظت کا حکم:

یہاں سے کہ اہل ایمان کو نفس کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اقْوُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا
 وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ
 غِلَاطٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ
 مَا يُؤْمَرُونَ ○

(۶۶/۶)

اے اہل ایمان اپنے نفوس اور اپنے اہل کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن
 انسان اور پتھر ہیں جس پر سخت دل مضبوط فرشتے مقرر ہیں جن کو جو حکم دیا جاتا
 ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ جو حکم دیا جائے بجالاتے ہیں۔

اسی طرح سورۃ المائدہ میں حکم خداوندی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ، لَا يَضُرُّكُمْ
 شَيْءٌ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللَّهِ فَرَجِعْكُمْ جَنَّةً
 فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ○

(۵/۱۰۵)

اے اہل ایمان اپنے نفوس کی حفاظت کرو جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا
 کچھ نہیں بگاڑ سکتا تم سب کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے اس وقت وہ تمہیں
 تمہارے تمام کاموں سے جو تم نے (دنیا میں) کیئے تھے اس سے تمہیں آگاہ
 کرے گا۔

ان دونوں آیات کریمہ (۶۶/۶) اور (۵/۱۰۵) میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے
 نفوس کی حفاظت کریں۔ اول الذکر آیت (۶۶/۶) میں تو انہیں اپنے اہل کی بابت بھی یہ حکم
 دیا گیا ہے کہ دونوں کو دوزخ کی آگ کا ایندھن بننے سے بچائیں۔ یہاں توجہ طلب امر یہ
 ہے کہ حکم اہل ایمان کو دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے نفوس کو دوزخ کی آگ سے بچائیں۔

نفس کی حفاظت سے مراد یہاں بدیہی طور پر اعمال بد سے اجتناب اور تقویٰ کی راہ اختیار کرنا ہے کیونکہ یہی وہ راہ ہے جس سے حفاظت نفس ممکن ہے۔ اسی وجہ سے متذکرہ بالا آیات (۶۶/۶) میں نفس کی عدم حفاظت کا انجام بھی بتا دیا گیا ہے کہ اگر تم ایسا نہ کر سکتے تو اس کا انجام محض دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ ہے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور بدترین عذاب جس سے رہائی کی کوئی صورت ممکن نہیں ہو سکے گی کیونکہ اس دوزخ پر جو فرشتے متعین ہیں وہ اللہ کے احکامات کی سختی سے پابندی کرنے والے ہیں لہذا وہاں استثناء یا رعایت کا کوئی سوال نہیں ہوگا لہذا بہر صورت نفس کی حفاظت یا بالفاظ دیگر تقویٰ کی راہ اختیار کرنا لازمی ہے۔

اس کے علاوہ ان دونوں آیات میں مزید توجہ طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں آیات میں نفس کی حفاظت کا حکم صرف اہل ایمان کو دیا گیا ہے جبکہ اس امر کی صراحت کی جا چکی ہے کہ نفس تمام انسانوں کو متوازن حالت میں عطا ہوتا ہے اور تمام انسانوں کی نجات کا دار و مدار نفس کے توازن کو برقرار رکھنے پر ہے۔ یہاں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر نفس کی حفاظت کے لیے خطاب صرف مسلمانوں سے ہی کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام انسانوں میں سے صرف مسلمانوں کا گروہ ہی ایک ایسا گروہ ہے جو اس حقیقت کو تسلیم کرتا اور اپنے نجات کی فکر کرتا ہے۔ ایسے لوگ جو اس حقیقت کو تسلیم ہی نہ کریں ظاہر ہے ان کے لیے نفس کی حفاظت کا تصور بے معنی ہے۔ اللہ پر ایمان کائنات کی سب سے پہلی سچائی ہے جسے تسلیم کرنا لازمی ہے۔ اللہ پر ایمان لانے کے بعد ان تمام حقائق کو تسلیم کرنا جن کا مطالبہ قرآن مجید کرتا ہے اس راہ کی دوسری منزل ہے۔ ایک مسلمان جو یہ سب کچھ کرتا ہے بلکہ دل کی گہرائیوں سے ایمان رکھتا ہے لہذا اس کے نفس کے توازن اور نشوونما کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دوسری

طرف وہ لوگ جو ان حقائق کو تسلیم ہی نہ کریں ظاہر ہے ان کے لیے نفس کی حفاظت کا انتباہ بے معنی ہے لہذا قرآن اس حوالے سے ان سے مخاطب ہی نہیں ہے۔

۷۔ نفس انسانی ذریعہ آزمائش:

از روئے قرآن انسان کو بہ حیثیت انسان اس کے مال اور نفس کے متعلق لازماً آزمایا جائے گا۔ یہ بنی نوع انسان کی ایک ایسی تقدیر ہے جس سے کوئی مفر نہیں ہے۔

لَتُبْلَوْنَ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ

(۳/۱۸۶)

تمہیں تمہارے اموال اور تمہارے نفوس سے متعلق ضرور آزمایا جائے گا۔

آزمائش کے حوالے سے قرآن مجید میں دو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اول 'نبلو' دوم 'فتنہ' ان الفاظ کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(i) نبلو

قرآن مجید آزمائش کے حوالے سے متعدد مقامات پر یہ لفظ آیا ہے جس کا مادہ بل و ہے اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) کسی کا حال معلوم کرنا یعنی اس کے متعلق جو باتیں معلوم نہ ہوں انہیں معلوم کرنا (۲) کسی چیز کی اصل حالت کا ظاہر ہونا خواہ وہ اچھی ہو یا بری۔ جب یہ لفظ خدا کے لئے استعمال ہوگا تو وہاں صرف دوسرے معنی مراد ہوں گے کیونکہ خدا اعلام الغیوب ہے اس لئے اس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی کی حالت سے بے خبر ہے۔ لہذا اس لفظ کے بنیادی معنی حالات کا معلوم کرنا یا اصل حقیقت کا ظاہر کرنا ہیں۔

یہ امر اللہ تعالیٰ کی شان سے بہت بعید ہے کہ وہ کسی کو آزمائے اسے تو ہر شے خواہ وہ کوئی بھی ہو اسکا کامل علم ہے جب وہ سب کچھ جانتا ہے تو اس کی جانب سے آزمائش ایک بے معنی بات ہے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انسان خود اپنی صلاحیتوں کو آزمائے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو ایسے مواقع بہم پہنچاتا ہے جس میں ان کی صلاحیتوں کی نمود کے مواقع ہوتے ہیں اس طرح انسان اپنی صلاحیتوں کو نمود دیتا ہے اسے مشکل حالات میں اپنی صلاحیتوں کی جانچ کے مواقع ملتے ہیں اور اس طرح اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش بھی درحقیقت اس کی رحمت ہے کیونکہ اس کے ذریعے انسان مشکلات سے نبرد آزما رہتا اور آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح اس کی شخصیت یا اقبال کی اصطلاح میں خودی کی تعمیر ہوتی ہے۔

سورۃ الدھر میں ”ابتلی“ کے لفظ کو قرآن مجید نے ایسے موقع پر استعمال کیا ہے جس سے مضمحل جوہروں کے محسوس شکل میں سامنے آنے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی پیدائش، مرد اور عورت کے نطفے کے امتزاج سے ہوتی ہے۔ نطفہ ایسے باریک جراثیموں پر مشتمل ہوتا ہے جو خوردبین کے بغیر نظر نہیں آسکتے لیکن انہی جراثیموں میں پورے کا پورا انسانی بچہ چھپا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے قرآن کہتا ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ وَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا

(۷۶/۲)

بَصِيرًا

ہم نے انسان کی پیدائش ایک ملے جلے نطفے سے کی (اور ایسا انتظام کیا کہ رحم مادر میں اس کے مضمحل جوہروں کی نمود ہوتی جائے) تا آنکہ وہ ایک سننے اور دیکھنے والا انسانی بچہ بن جائے۔

یہ ہے ابتلا کا صحیح نقشہ۔ مضمحل جوہروں کا مخصوص شکل میں سامنے آجانا۔ ان کی نمود ہو جانا۔
تصریحات بالا سے واضح ہے کہ ابتلا سے مراد خدا کی جانب سے کسی کو آزمانا نہیں کیونکہ یہ
بذات خود ایک بے معنی بات ہے۔ ایک جامع العلوم ہستی کے بابت یہ تصور ممکن نہیں۔ لہذا
آئندہ مباحث میں لفظ ”آزمائش“ سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمود ذات کے مواقع
کی فراہمی ہوگا تاکہ انسان اپنی شخصیت / انا / خودی کی تعمیر کر سکے۔ یہ تعمیر اچھے اور برے
دونوں قسم کے حالات میں ممکن ہوتی ہے یعنی مشکلات اور کامیابیوں و کامرانیوں کے ادوار
میں بھی۔ اسی وجہ سے آزمائش دونوں صورتوں میں ممکن ہے۔

سورۃ البقرہ میں بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ قوم فرعون تمہیں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا
رکھا کرتی تھی ہم نے تمہیں ان کے پیچھے استبداد سے نجات دلائی۔

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنَ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ
يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ
بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ۝

(۲/۴۹)

اور جب ہم نے تم کو قوم فرعون سے مخلصی بخشی وہ تم کو بڑا دکھ دیتے تھے تمہارے
بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اسمیں تمہارے رب
کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔

قوم فرعون کے مظالم سے بنی اسرائیل کو نجات اس لیے دلائی تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ آزادی
ملنے پر وہ کس قسم کے طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ غزوہ بدر میں اللہ کی امداد و تائید کا مقصد
احسانات کی جانچ تھی۔

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ
 إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ، وَلْيُبَلِّغِ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ
 بَلَاءً حَسَنًا ۗ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

(۸/۱۷)

تم نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے ان کو قتل کیا اور (اے محمد) جس
 وقت آپ نے کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ آپ نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی
 تھیں اس سے غرض یہ تھی کہ مومنوں کو اپنے (احسانوں سے) اچھی طرح
 آزمائے بے شک خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

بنی اسرائیل کو اقوام عالم سے منتخب کیا گیا انہیں دیگر اقوام کے مقابلے میں سرفراز کیا گیا
 انہیں جو مقام دیا گیا اس میں بھی ان کی نمود ذات کے مواقع تھے۔

وَلَقَدْ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَی الْعَالَمِينَ ۝
 وَاتَّيْنَاهُمْ مِّنَ الْآيَاتِ مَا فِيهَا بَلَاءٌ مُّبِينٌ ۝

(۲۲/۳۲-۳۳)

ہم نے بنی اسرائیل کو اہل عالم سے دانستہ منتخب کیا تھا اور ان
 کو ایسی نشانیاں دی تھیں جن میں صریح آزمائش تھی۔

ظاہر کر دینے کے معنی میں یہ لفظ سورۃ الطارق میں آیا ہے

(۸۶/۹)

يَوْمَ تُبَلِّغُ الشَّرَآئِرُ

جس دن تمام چھپی ہوئی باتیں ظاہر کر دی جائیں گی۔

سورۃ آل عمران میں ہے:

(۳/۱۵۴)

وَلَيَبْتَلِيَنَّ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ

تاکہ اللہ ان باتوں کو ظاہر کر دے جو تمہارے سینوں میں تھیں۔

(۱۰/۳۰)

هَذَا لِك تَبْلُوا كُل نَفْسٍ مَّا اسْلَفَتْ

وہاں ہر شخص اپنے اعمال کو سامنے موجود دیکھے گا جو اس نے پہلے کیئے تھے۔

اسی طرح بعض دیگر مقامات مثلاً (۲۳/۳۰) میں بھی اسے ظاہر کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابتلا سے مراد نمود ذات ہے جو مشکل حالات اور سہولت و آسائش دونوں صورتوں میں ممکن ہوتی ہے اور جو اسمیں سرخرو ہو جاتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں اس کی بہترین مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے جو اسی قسم کی مختلف آزمائشوں میں پورے اترے اور کامیاب ہوئے۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَتْهُنَّ قَالَ إِنِّي

جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا

(۲/۱۲۴)

يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ

جب ابراہیم کو اس کے رب نے بعض باتوں کے ذریعے سے آزمایا اور اس نے ان کو پورا کر دکھایا (اس پر اللہ نے فرمایا) میں یقیناً تجھے انسانوں کا امام مقرر کرنے والا ہوں۔

(ii) - فتنہ:

آزمائش کے حوالے سے قرآن مجید میں جو دوسرا لفظ استعمال ہوا ہے وہ فتنہ ہے۔ اسکا مادہ

فتن ہے اس کے بنیادی معنی ہیں سونا یا چاندی کو آگ میں گلانا تاکہ اس کا کھوٹ الگ ہو جائے۔ اس سے اس کے معنی کسی چیز کی اصلیت کو ظاہر کرنے کے آتے ہیں چنانچہ الفتانہ کسوٹی کو کہتے ہیں جس پر سونا چاندی کو گھس کر ان کی اصلیت کو ظاہر کیا جاتا ہے یہیں سے فتنہ کی معنی تاؤ دے کر پرکھنے اور آزمائش کرنے کے آتے ہیں۔ (۲۰/۴۰) میں اسے آزمائش کے معنوں میں استعمال کیا گیا اس کے علاوہ (۲۹/۲-۳)، (۳۹/۴۹)، (۴۳/۱۷)، (۶۴/۱۵) وغیرہ میں بھی اسے آزمائش کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ آزمائش کے علاوہ دیگر مختلف معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے مثلاً (۹/۱۲۶) میں اسے جنگ کی مصیبتوں اور مشکلات کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

(۳۷/۱۶۲) میں صحیح راستے سے ہٹا کر غلط راہ پر لگا دینے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

(۴/۹۱) میں اسے جنگ کے معنوں میں (۳۹/۴۹)، (۵/۴۹) اور (۱۷/۷۳) میں اسے

گمراہی یا راہ ہدایت سے ہٹا دینے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ (۲۲/۱۱) میں اسے خیر

کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے (۲۰/۱۹۳) اور (۸/۳۹) میں اسے ان رکاوٹوں کے لیے

استعمال کیا گیا ہے۔ جو دین خداوندی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ ایذا، مصیبت اور تکلیف

کے معنوں میں (۲۲/۱۱) سزا یا عذاب کے معنوں میں (۳۷/۶۳)، دھوکا اور فریب کے معنوں

میں (۲۰/۱۰۲)، فریب خوردہ اور گمراہ کے معنوں میں (۶۸/۶)، سزا دینے کے معنوں میں

(۶/۵۳) اور معذرت اور حجت کے معنوں میں اسکا استعمال (۶/۲۳) کیا گیا ہے۔

جہاں تک آزمائش کا تعلق ہے از روئے قرآن بنی نوع انسان کی تخلیق کا مقصد ہی آزمائش

ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو مختلف قسم کے مواقع فراہم کرتا ہے جن سے ان کی ذات کی

نمود ہو سکے۔ اس کٹھالی سے تمام انسانوں کو بہر صورت گذرنا ہوتا ہے یہ مشیت ایزدی کی

ایک ایسی تقدیر ہے جس سے کسی صورت کسی انسان کو فرار ممکن نہیں ہے۔ موت و حیات کی تخلیق کا مقصد ہی انسانوں کی آزمائش ہے۔

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ
أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ

(۶۷/۲)

اس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے اور وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔

یہ امر تخلیق ارض و سماوات کے وقت سے ہی معین ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ
أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ
أَحْسَنُ عَمَلًا

(۱۱/۷)

اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں خلق کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے عمل والا کون ہے؟

سختی اور آسودگی دونوں اس آزمائش کی مختلف شکلیں ہیں۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ
وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۗ وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ۝

(۲۱/۳۵)

ہر تنفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں اور تمہیں ہماری طرف ہی لوٹنا ہے۔

اس آزمائش کا ذریعہ زمین پر اور زمین میں پیدا کی جانے والی تمام تر اشیاء ہیں۔ بالفاظ دیگر

زمین کی ہر ہر شے انسان کے لیے ذریعہ آزمائش ہے۔ بالفاظ دیگر پوری حیات ایک جامع آزمائش ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوهُمْ
أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝

(۱۸/۷)

روئے زمین پر جو کچھ ہے ہم نے اس کو زمین کے لیے آرائش کا باعث بنایا ہے تاکہ لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے کون اچھے عمل کرنے والا ہے۔

نہ صرف روئے زمین کی تمام اشیاء بلکہ تمام انسان باہم ایک دوسری کی آزمائش کا ذریعہ ہیں اور اس آزمائش میں بہر حال صبر لازمی ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا
أَنَّهُمْ لِيَأْكُلُوا الطَّعَامَ وَيَشْرَبُوا فِي
الْأَسْوَاقِ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً
أَتَصْبِرُونَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا ۝

(۲۵/۲۰)

اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہم نے تمہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا کیا تم صبر کرو گے اور تمہارا رب تو دیکھنے والا ہے۔

یقیناً اللہ تعالیٰ کے لیے یہ امر کوئی مشکل نہ تھا کہ تمام انسانوں کو ایک ہی دستور و منہاج کا پابند کر دیتا۔ اس طرح تمام انسان ایک طریقے اور دستور کے پابند ہو جاتے تاہم مشیت ایزدی کا منشاء جانچ کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عطا کی جانے والی تمام تر اشیاء کو ان کی ذات کی نمود و ترقی کا ذریعہ بنایا ہے تاکہ انسان اپنی ذات کی خود نشوونما کر سکے۔

لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَا جَاءَ
 وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ
 فِي مَا آتَيْتُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ
 جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝

(۵/۴۸)

تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک دستور اور راہ مقرر کر دی ہے اگر اللہ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس کی مشیت یہ ہے کہ اس نے جو تمہیں دیا ہے اس میں سے تمہیں آزمانے سو تم نیکیوں کی طرف جلدی کرو۔

اس آزمائش میں مسلمانوں کے لیے کوئی رعایت یا استثناء نہیں ہے یہاں ایک قانون ہے اور سب کے لیے ہے اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔

الْقَمَرِ ۝

أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ
 لَا يُفْتَنُونَ ۝

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ
 صَادَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ۝

(۲۹/۱-۳)

آئم۔ کیا یہ لوگ یہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ (صرف) یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لائے، چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی اور جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں ہم نے ان کو بھی آزمایا تھا (اور ان کو بھی آزمائیں گے) یقیناً اللہ انہیں بھی جان لے گا جو سچ کہتے ہیں اور انہیں بھی معلوم کر لے گا جو جھوٹے ہیں۔

ماضی کے نظائر میں قوم فرعون اور بنی اسرائیل ہیں جنہیں مختلف حوالوں سے جانچا گیا

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ ۝ (۲۲/۱۷)

اور ان سے پہلے ہم نے قوم فرعون کی آزمائش کی اور ان کے پاس ایک عالی قدر پیغمبر آئے۔

بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا کہ ان کو ایسی نشانیاں دی گئی تھیں جن میں صریح آزمائش تھی۔

وَلَقَدْ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَيَّ الْعَالَمِينَ ۝
وَ اتَّيْنَاهُمْ مِّنَ الْآيَاتِ مَا فِيهَا بَلَاءٌ مُّبِينٌ ۝

(۲۲/۳۲-۳۳)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو اہل عالم سے دانستہ منتخب کیا تھا ان کو ایسی نشانیاں دیں تھیں جن میں صریح آزمائش تھی۔

مثلاً اس حوالے سے سبت کے دن مچھلی نہ پکڑنے کا حکم بھی ایک آزمائش تھا

وَسَأَلَهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ
إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِينَانُهُمْ يَوْمَ
سَبْتِهِمْ شُرْعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ ۚ لَا تَأْتِيهِمْ
كَذَلِكَ ۚ نَبَلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝

(۷/۱۶۳)

اور آپ ان لوگوں سے اس بستی والوں کا جو کہ دریائے (شور) کے قریب آباد تھے اس وقت کا حال پوچھیے جبکہ وہ ہفتے کے بارے میں حد سے نکل رہے تھے جبکہ ہفتے کے روز مچھلیاں تو ظاہر ہو ہو کر ان کے سامنے آتی تھیں اور جب ہفتے کا دن نہ ہوتا تو ان کے سامنے نہ آتیں ہم ان کی اس طرح آزمائش کرتے تھے کیونکہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کی آزمائش کی یہ سنت آج بھی جاری ہے اس کی شکل کچھ بھی ہو سکتی ہے یہ مال اور اولاد کی شکل میں ممکن ہے۔

لَا تَبْتَئَا أَمْوَالِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ فَتَنَّهُ وَاللَّهُ
عِنْدَهُ أَجْدُ عَظِيمٌ ۝

(۶۴/۱۵)

تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو آزمائش ہے اور اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

اس کی شکل دشمنوں کا ڈر، بھوک، پیاس اور مال و جان کا خسارہ یا کسی بھی دیگر صورت میں ممکن ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ
الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝

(۲/۱۵۵)

اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے، دشمن کے ڈر سے، بھوک
پیاس سے، مال و جان اور پھلوں کی کمی سے اور صبر کرنے والوں کیلئے خوشخبری ہے۔

(۳/۱۸۶) میں بھی اس حقیقت کا اعادہ کیا گیا ہے کہ تمہاری مالوں اور نفوس سے آزمائش کی
جائے گی۔ دنیاوی آرائشوں کی چیزوں کی دستیابی بھی آزمائش ہی کی ایک شکل ہے۔

وَلَا تَمُنَّ بِعَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا
مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهَا ۗ
وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝

(۲۰/۱۳۱)

اور کئی طرح کے لوگوں کو ہم نے دنیا کی آرائش کی چیزوں سے بہرہ مند کیا تاکہ
ان کی آزمائش کریں ان پر نگاہ نہ کرنا اور تمہارے رب کا عطا کیا ہوا رزق بہتر اور

باقی رہنے والا ہے۔

آزمائش کا مقصد:

جہاں تک اس ہمہ جہت آزمائش کا تعلق ہے اس کے مقصد کی وضاحت بھی خود قرآن مجید میں باصراحت کر دی گئی ہے یعنی اس کا مقصد شکر گزاری ہے۔ شکر گزاری سے مراد ایسے اعمال صالحہ ہیں جن سے اللہ کی رضا حاصل ہو۔ اور اس کا بالواسطہ اور بلاواسطہ فائدہ انسانی نفس کو ہی ہوتا ہے یہ حقیقت پھر اس امر کی تصدیق ہے کہ آزمائش سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ اللہ کسی کو جاننا چاہتا ہے بلکہ اس کا مقصد انسانی انا/خودی/شخصیت کو جو خام حالت میں ہوتی ہے اسے مختلف تجربات و حادثات و واقعات کی کٹھالی سے گزار کر کندن بنانا ہے۔ اس کی تصدیق مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔

قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ
إِلَيْكَ ظَرْفُكَ ۖ فَلَمَّا رآه مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِن
فَضْلِ رَبِّي ۖ أَنِّي لَبِئْسَ لُؤِيٍّ ۖ أَشْكُرُ ۖ أَمْ أَكْفُرُ ۚ وَمِنَ الشُّكْرِ
فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۚ وَمِنَ كُفْرٍ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ ﴿٢٧/٢٠﴾

جس کے پاس کتاب کا علم تھا بول اٹھا کہ آپ پلک جھپکائیں اس سے بھی پہلے
میں اسے آپ کے پاس پہنچا سکتا ہوں جب آپ نے اسے اپنے پاس موجود پایا
تو فرمانے لگے کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر
گزاری کرتا ہوں یا ناشکری، شکر گزار اپنے ہی نفس کے لیے شکر گزاری کرتا
ہے اور جو ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور کریم ہے۔

اس آیت کریمہ سے مترشح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایات اسکا فضل ہیں اللہ کا فضل اس کی

جانب سے آزمائش کا درجہ رکھتا ہے اور آزمائش کا مقصد شکر گذاری ہے اگر انسان اللہ کی جانب سے ملنے والی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرے یعنی ان نعمتوں کو خلق خدا کی بہتری کے لیے یا اعمال صالح کے لیے استعمال کرے تو اس سے انسان کے نفس کو فائدہ ہوتا ہے اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ انسانی زندگی کا بنیادی مقصد اور اس کی کامیابی کا معیار نفس کے توازن کو برقرار رکھنا ہے جو شخص بھی ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا وہ کامیاب و کامران ہے اور جو ایسا نہیں کر سکا وہ خاسر اور ناکام و نامراد ہے۔ اور اس کامیابی کی واحد راہ نیکیوں اور اعمال صالح کی راہ ہے یہی وجہ ہے کہ آزمائش کے عنوان کے تحت بیان کردہ متذکرہ بالا آیات (۶۷/۲)، (۱۱/۷)، (۱۸/۷) اور (۵/۳۸) میں تمام جگہوں پر آزمائش کا ایک ہی مقصد بتایا گیا ہے یعنی اس امر کی جانچ کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے یا یہ کہ تم لوگ نیکیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو تا کہ نفس انسانی کی زیادہ سے زیادہ تعمیر ہو سکے جو کہ انسانی زندگی کا مقصود و منتہا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے۔

۸۔ کسی نفس انسانی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کیا جاتا:

اللہ تعالیٰ کسی نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا یہ بنیادی حقیقت قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے مثلاً سورۃ البقرہ میں ارشاد خداوندی ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

(۲/۲۸۶)

اللہ کسی نفس کو مشقت میں نہیں ڈالتا سوا اس کے کہ اسے اس کی وسعت بھی دی ہو۔

اس مضمون کا اعادہ (۲/۲۳۳)، (۷/۲۲)، (۲۳/۶۲) میں بھی کیا گیا ہے آیت (۲/۲۸۶) کے متذکرہ بالا الفاظ میں سے دو الفاظ پر یہاں خصوصی تدبیر لازم ہے یہ الفاظ یکلف اور وسعھا ہیں۔

جہاں تک یکلف کا تعلق ہے اس کا مادہ ک ل ف ہے اس کے معنی کسی کام کو مشقت کے باوجود برداشت کرنے کے ہیں اس سے مراد ہر قسم کی مصیبت یا صعوبت ہوتی ہے جسے یہ وقت برداشت کیا جائے۔ دوسری طرف وسعھا کا مادہ وس ع ہے اس کے معنی وسعت، طاقت اور اختیار رکھنے کے ہیں۔ اس سے مراد وہ طاقت ہوتی ہے جو کسی مطلوبہ کام سے زائد ہو۔ اس بنیاد پر آیت (۲/۲۸۶) کے متذکرہ بالا الفاظ کا مفہوم یوں بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کسی بھی نفس کو کسی بھی کام کرنے کی جو صلاحیت / وسعت عطا کرتا ہے اس کے ذمے جو کام لگایا جاتا ہے وہ اس کی صلاحیت سے کم ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر پہلے کسی نہ کسی حوالے سے کوئی نہ کوئی اضافی اہلیت / صلاحیت اللہ کی جانب سے عطا کی جاتی ہے پھر اس صلاحیت اور اہلیت کے مطابق کام اس نفس سے لیا جاتا ہے تاہم جو کام بھی اللہ تعالیٰ اس سے لیتا ہے وہ اپنی عطا کردہ صلاحیت سے کم ہی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حضور دست بہ دعا رہنا چاہئے کہ:-

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا

أَوْ أَخْطَأْنَا، رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ

عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا، رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ

لَنَا بِهِ، وَاعْفُ عَنَّا، وَاعْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا، إِنَّكَ

مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝

اے ہمارے رب اگر ہم سے بھول چوک ہو گئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کر۔ اے ہمارے رب ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب حقیقتاً بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا ہمارے سر پر نہ رکھ اور اے ہمارے رب ہمارے گناہوں سے درگزر فرما ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا مالک ہے اور ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرما۔

یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی نفس / انسان پر بوجھ ڈالنے سے کیا مراد ہے؟ اور دوم یہ کہ جب اللہ کی ذات ایک کامل ذات ہے وہ کسی بھی قسم کی حاجت یا ضرورت یا احتیاج سے مکمل ماورا ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں باصراحت متعدد دفعہ اپنی ذات کے متعلق یہ کہا ہے کہ وہ کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا تو آخر وہ انسانوں پر بوجھ کیوں ڈالتا ہے؟

اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ انسان پر بوجھ ڈالنے سے خود انسانی نفس / ذات کی نشوونما ہوتی ہے اس میں خالق کائنات کی ظاہر ہے اپنی کوئی حاجت نہیں۔ اس سے حاجت یا ضرورت کا تصور تک منسوب نہیں ہو سکتا۔ وہ اس لیے انسانوں کو مختلف آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے کہ اس کے نتیجے میں خود نفس انسانی یا انسانی ذات کی ترقی یا نشوونما ہوتی ہے۔

۹۔ نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ:

قرآن مجید انسانی شخصیت کے دونوں اجزاء یعنی انسان اور اللہ کی جانب سے عطا کیے جانے والے نفس، نفس انسانی کے حوالے سے تین مختلف اصطلاحات استعمال کرتا ہے یعنی نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ۔ ان تینوں کی مختصر اوضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

نفسِ امارہ:

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے انسانی شخصیت کے جزو اول انسانی شعور کی دو سطحیں ہیں اول حیوانی سطح دوم انسانی سطح۔ حیوانی سطح پر نفسِ انسانی کا کل مطمع نظر صرف اور صرف جسمانی ضروریات کی تکمیل اور حصولِ لذت ہوتا ہے جسے نفسِ امارہ کہا جاتا ہے۔

نفسِ امارہ کا بنیادی مقصد جسمانی حاجات کی ہر صورت تکمیل کے ساتھ ساتھ لذت کا حصول ہوتا ہے۔ نفسِ امارہ کا کردار اس حوالے سے اس وقت مکمل منہی ہو جاتا ہے جب انسان خود اپنے منہی اعمال کی وجہ سے اس درجہ گر جائے کہ اللہ کی رحمت اس سے منہ موڑ لے۔ اس صورت میں نفسِ امارہ کا کام صرف اور صرف برائیوں کی جانب راغب کرنا رہ جاتا ہے۔

وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ

إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ○ (۱۲/۵۳)

اور میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا کیونکہ نفس (امارہ) برائی پر ابھارنے والا

ہی ہے الا یہ کہ میرا رب ہی رحم کرے میرا رب یقیناً غفور اور رحیم ہے۔

اس امر سے قطع نظر کہ اس آیت میں منقول بیان کس کا ہے یہ آیت اپنی جگہ پر نفس (امارہ) کے متعلق ایک بنیادی حقیقت کا بیان ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے دائرہ رحمت میں رکھے تو بات الگ ہے لیکن اگر انسان اپنے اعمالِ بد سے خود کو اس کی رحمت سے دور کر لے تو نفس (امارہ) کا کام صرف اور صرف برائی کی ترغیب دینا رہ جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے نفس (امارہ) انسانی اعمالِ بد کو انسان کے سامنے خوبصورت کر کے دکھاتا ہے، وہ انسانوں کو خود غرضی کی جانب مائل کرتا ہے، مختلف نوعیت کے وسوسے پیدا کرتا ہے،

انسانوں کو عدل کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے، انسانوں کو اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی پر اکساتا ہے اور دنیا کو اس انداز میں پرکشش بنا کر پیش کرتا ہے کہ انسان صرف اور صرف دنیاوی مفادات کا اسیر ہو جاتا ہے اور زندگی کے اصل مقصد یعنی اخروی کامیابی کے حصول سے لاپرواہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نفس (امارہ) انسان کی مکمل تباہی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔ تاہم قنبد مکرر کے طور پر یاد رکھیے کہ انسان کو اپنے نفس پر مکمل قدرت حاصل ہے انسان اگر چاہے تو ان نفسانی خواہشات پر مکمل کنٹرول حاصل کر سکتا ہے اور راہ ہدایت کا مسافر بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ خود ایسا کرنا چاہے اگر وہ خود ہی نہ کرنا چاہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟

اس حوالے سے ایک دوسرا اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ جب انسان نفسِ امارہ کا غلام بن جاتا ہے تو شیطان بھی اس کا اس راہ میں ہمقدم بن جاتا ہے۔ شیطان کا تو مقصد ہی بنی نوع انسان کی تباہی ہے اور اس تباہی کی راہ پر اگر انسان خود ہی چلنا شروع کر دے تو شیطان اس کو مزید ورغلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ اس طرح تباہی کا نشہ دو آتشہ ہو جاتا ہے اور انسان حتیٰ طور پر جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔ لیکن یہ راہ اس کی خود اختیار کردہ ہوتی ہے اپنے حتیٰ تجزیے میں روز قیامت انسان خود تسلیم کرے گا کہ اپنی تباہی کا وہ خود ذمے دار ہے۔

ان دونوں حوالوں سے کہ نفس کس طرح انسان کو ورغلاتا ہے اور کس طرح شیطان اس کو مزید تباہی کی جانب لے جاتا ہے اس پر مفصل بحث پانچویں باب میں کی گئی ہے۔

نفسِ لوامہ:

نفسِ انسانی، انسانی شخصیت کا دوسرا جزو جو انسان کو بطور امانت متوازن حالت میں اللہ کی جانب سے عطا ہوتا ہے وہ انسان کو اس کے افعال بد پر مسلسل ٹوکتا رہتا ہے۔ نفسِ انسانی کا

یہ پہلو نفسِ لوامہ کہلاتا ہے۔

لوامہ کا مادہ ل و م ہے جس کے بنیادی معنی ہیں ملامت کرنا، کسی کو برا بھلا کہنا۔ قرآن مجید میں اسے متعدد مقامات پر انہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے مثلاً:

فَلَا تَكُلُوا مَوْلَىٰ وَلَا مَوْلَىٰكُمْ (۱۴/۲۲) تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے نفوس کو ملامت کرو۔

لَا يَخَافُونَ يُومَةَ لَأِیْمٍ (۵/۵۴) وہ کسی ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

مَلُومٌ (۵۱/۵۴) ملامت کیا ہوا۔

مَلِیمٌ (۳۷/۱۳۲) قابل ملامت

یَتَلَاؤُمُونَ (۶۸/۳۰) ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ وغیرہ

بطور اصطلاح یا نفس کی ایک خاص کیفیت یا صورتحال کے حوالے سے اس کا بیان سورۃ القیمۃ میں آیا ہے۔

وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ (۷۵/۲)

اور میں قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو ملامت کرنے والا ہو۔

قسم، دلیل یا شہادت کو کہتے ہیں جو حق اور باطل کو الگ الگ کر کے رکھ دے اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نفسِ لوامہ کی قسم کھائی ہے یعنی ملامت کرنے والا نفس۔

یہ ہمارا ایک عام مشاہدہ ہے کہ ایک انسان جب کوئی غلط فعل انجام دیتا ہے تو اس کے اندر ایک ندامت کا احساس جاگتا ہے جو اسے اس فعل پر ندامت کا احساس دلاتا ہے اسے

ضمیر (Conscience) کہا جاتا ہے۔ تاہم یہاں یہ واضح رہے کہ ضمیر کی آواز حق و باطل کے مابین معیار نہیں بن سکتی کیونکہ بنیادی طور پر یہ وہ احتجاج ہے جو نفس انسان کے خلاف کرتا ہے انسان جو بھی افعال انجام دیتا ہے ان کا براہ راست اثر نفس پر پڑتا ہے۔ اچھے افعال یا اعمال صالح سے نفس کی نشوونما ہوتی ہے یا اس کا توازن مستحکم ہوتا ہے جبکہ افعال بد یا نفس پر ظلم سے اس کا توازن بگڑتا ہے۔ انسان جب کوئی ایسا فعل انجام دیتا ہے جو نفس پر ظلم کے زمرے میں آتا ہو تو اپنے توازن کے بگڑنے پر نفس انسان کو جو اذیت دیتا ہے وہ کیفیت نفس لوامہ کہلاتی ہے۔ نفس کا یہ حصہ چونکہ خالصتاً اللہ کی امانت ہے لہذا وہ کسی برے فعل کو قبول ہی نہیں کر سکتا۔ یہاں واضح رہے کہ نفس کا یہ احتجاج صرف ان افعال پر ہوتا ہے جو انسان ظلم کی شکل میں انجام دیتا ہے۔ قرآن مجید میں باصراحت ان افعال کا بیان موجود ہے جنہیں ظلم قرار دیا گیا ہے۔ (اسی طرح ان افعال کی تفصیل بھی قرآن مجید میں دی گئی ہے جو اعمال صالح کہلاتے ہیں دیکھیے تیسرا باب) بنیادی طور پر نفس ظلم قرار دیئے جانے والے افعال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے جو اس کا اصل فریضہ بھی ہے۔ تاہم یہ بھی ایک عام مشاہدہ ہے کہ نفس کا یہ احتجاج صرف انہی افعال کے خلاف نہیں ہوتا جنہیں قرآن مجید فرقان حمید میں ظلم قرار دیا گیا ہے بلکہ یہ کیفیت عام سماجی رسوم و رواج، غلط سلط تصورات، من گھڑت عقائد، بے بنیاد تصورات کی خلاف ورزی سے بھی پیدا ہو جاتی ہے مثلاً ایک ہندو اگر اپنے مذہبی تصورات کے خلاف گائے کا گوشت کھاتا ہے تو بھی وہ اپنے اندر ملامت کا احسان پاتا ہے اس ملامت کی شدت افراد کے لحاظ سے کم و بیش ہو سکتی ہے تاہم ہوتی ضرور ہے۔ اسی طرح سے دیگر افعال بھی جو اس فہرست میں قطعی طور پر

نہیں آتے جنہیں قرآن نے ظلم قرار دیا ہے ایسے افعال کو اگر سماجی اور مذہبی تقدس بخش دیا گیا ہو تو ان کی خلاف ورزی پر بھی انسان اپنے اندر اسی طرح کی خلش محسوس کرتے ہیں سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟

بالفاظِ دیگر سوال یہ ہے کہ اگر نفس کا احتجاج صرف ان افعال تک محدود ہے جنہیں قرآن نے نفس پر ظلم قرار دیا ہے تو نفس عام سماجی، تہذیبی، معاشرتی بلکہ من گھڑت تصورات اور بے بنیاد عقائد کی خلاف ورزی پر کیوں خلش پیدا کرتا ہے؟ اس سوال کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ انسان خود نفس کو گمراہ کرتا ہے۔ ایک انسانی بچہ جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے جن عقائد، تصورات، اعتقادات، رواجوں کو "مقدس" گردانتا ہے تو اپنے نفس کے گرد بھی وہی ہالاتان دیتا ہے۔ قند مکرر کے طور پر یاد رکھیے کہ انسان کو اپنے نفس پر مکمل قدرت حاصل ہے لہذا انسان اسے ایک خاص سانچے میں ڈھال دیتا ہے اور نفس اسی ماحول میں اپنا بنیادی فریضہ انجام دیتے لگتا ہے یعنی اگر انسان مروجہ تصورات، خیالات، عقائد یا سماجی اور مذہبی تصورات کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کا نفس اسے اسی طرح ملامت کرنے لگتا ہے۔

بالفاظِ دیگر انسانی نفس اپنا اصل فریضہ بدستور انجام دے رہا ہوتا ہے لیکن خود انسان اسے گمراہ کر دیتا ہے۔ اس طرح نفس لوامہ اپنا اصل کام تو بالکل صحیح انداز میں کر رہا ہوتا ہے لیکن اس کا پس منظر مکمل طور پر تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کی مثال ریلوے کے کانٹا بدلنے والے سے دی جاسکتی ہے اگر ایک خاص مقام پر کسی ٹرین کا کانٹا، کانٹا بدلنے والے نے غلط تبدیل کر دیا ہو تو ٹرین، اس کا ڈرائیور اور دیگر تمام چیزیں بدستور ہی رہتی ہیں لیکن ٹرین، اپنی اصل منزل سے لفظ بہ لفظ دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ وہ صورت حال ہے جب انسان خود اپنے نفس کو آپ ہی گمراہ کرتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَدَّتْ طَّارِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ

وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ (۳/۶۹)

بعض اہل کتاب اس امر کی خواہش رکھتے ہیں کہ تم کو گمراہ کر دیں مگر انہوں نے اپنے نفوس کو گمراہی میں ڈالا ہوا ہے اور اس کا شعور بھی نہیں رکھتے۔

قرآن مجید کی یہ آیت متذکرہ بالا استدلال کا بین ثبوت ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ماسوا قرآن مجید دنیا میں کوئی الہلامی کتاب اپنی اصل حالت میں موجود نہیں۔ لہذا ماسوا قرآن مجید عقائد و نظریات کی جو بھی عمارت تعمیر کی جائے گی وہ انسانوں کے اپنے خیالات و نظریات تو ہو سکتے ہیں انہیں وحی کی تائید بہر حال حاصل نہیں۔

مستقل اخلاقی اقدار کا سرچشمہ صرف قرآن مجید ہے:

اس حوالے سے تاریخ سے کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جہاں انسانوں نے اپنے خود ساختہ نظریات کو اخلاق یا اخلاقی اقدار کا نام دے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اقوام میں مختلف ضوابط اخلاق پائے جاتے ہیں۔ ایک امر ایک قوم میں قابل تحسین ہے تو وہی امر دوسری قوم میں معیوب۔ مثلاً تاریخ میں ایسے قبائل بھی گزرے ہیں جہاں ماں باپ کو کھا جانا ایک مقدس مذہبی فریضہ متصور ہوتا تھا۔ بعض اقوام میں بدیانتی ایک قابل فخر فعل شمار کی جاتی رہی ہے جن میں ہندوستان کے ٹھگوں کی مثال بھی دی جاسکتی ہے، قدیم یونان کی ریاست اسپارٹا میں چوری بہت بڑی خوبی سمجھی جاتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت پوری دنیا میں غلامی کا رواج عام تھا جسے اسلام نے ختم کیا۔ امریکہ میں یہ گزشتہ صدی تک موجود تھی۔ گویا اخلاق ہمیشہ اپنے ماحول سے جنم لیتا ہے یا یوں کہ لیجئے کہ اخلاقی ضوابط محض معاشرہ کے رسوم و رواج ہوتے ہیں جو بتدریج مسلمات کا مقام حاصل کر لیتے ہیں

اور انسان انہی کو اخلاقی اقدار تصور کرنے لگتا ہے۔

تاہم یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ صرف ان نام نہاد رسوم کی پابندی کوئی معیار نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص جو فی الواقعہ انسانی سطح پر زندگی گزارنا چاہے اسے مروج اخلاقیات کا تنقیدی جائزہ لیتے رہنا چاہیے تاکہ انکی اصلاح ہوتی رہے۔ معاشرتی رسوم و رواج میں اصلاح کی یہی واحد صورت ہے۔ اس کی بین مثال مردم خوری، انسانی قربانی اور انسانی شکار جیسے معاملات ہیں جو پہلے عقائد کا درجہ رکھتے تھے تاہم بعد کے انسانوں کے احتجاج سے بتدریج ختم ہوتے چلے گئے۔

اس کے ساتھ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ بظاہر ایک فرد جس معاشرہ میں ہوش سنبھالتا ہے اس کے رسوم و رواج میں اپنے آپ کو پابند پاتا ہے لیکن درحقیقت انسان اپنے اعمال کو سوسائٹی کے معیارات سے نہیں بلکہ اپنے داخلی تصورات سے ناپتا ہے۔ کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا معاشرہ کوئی نوٹس نہیں لیتا لیکن فرد ذاتی طور پر انہیں برا محسوس کرتا ہے بالفاظ دیگر ماحول انسان کو نہیں بدلتا بلکہ انسان ماحول کو تبدیل کرتا ہے اور اس طرح سے ماحول علت (Cause) نہیں بلکہ معمول (Effect) بن جاتا ہے۔ یعنی فطرت انسان کو نہیں بلکہ انسان فطرت کو متاثر کرتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ذہن میں رکھئے کہ داخلی اخلاقی شعور جسے ضمیر کہا جاتا ہے وہ بھی کوئی ٹھوس معیار نہیں ہے۔ انسان کو چونکہ ضمیر (اللہ کی جانب سے عطا ہونے والے نفس) پر برتری حاصل ہے لہذا انسان نفس لوامہ کے اثرات کے تحت نفس کو گمراہ کر سکتا ہے اور کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے فیصلے لفظ بہ لفظ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اسی طرح

انسانی شعور اس قابل نہیں ہے کہ وہ اس قسم کا کوئی فیصلہ کر سکے کہ کیا اچھا ہے یا کیا برا ہے۔ اس حوالے سے مثالیں پیچھے دی جا چکی ہیں کہ کس طرح انسان آج ایک چیز کو اخلاق کے دائرے میں لاتا ہے کل اسے چھوڑ دیتا ہے۔ آج مغرب کا اخلاقی معیار یہ ہے کہ لواطت جائز ہے لیکن کیا کوئی بھی عقل سلیم کا حامل شخص اسے قبول کر سکتا ہے؟

لہذا اخلاقی اقدار نہ داخلی ہو سکتی ہیں نہ خارجی یعنی نہ ضمیر کی بنیاد پر اور نہ عقل کی بنیاد پر ان کا تعین ممکن ہے۔ یہ امر بذات خود اس امر کا غماز ہے کہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں کوئی مطلق اخلاقی معیار لامحالہ ہونا چاہئے اور جو تمام انسانوں کے لئے یکساں ہو جو یقیناً مادی اشیاء میں موجود نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے لامحالہ یہ ماننا ضروری ہے کہ:

(الف) یہ کائنات بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی بلکہ اس کی تخلیق کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔

(ب) یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ نفسِ انسانی ایک مستقل حقیقت ہے جو جسمانی تغیرات سے ماورا ہے۔

(ج) تمام انسانی افعال اس کے شعوری فیصلوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جنکی ذمے داری بھی انسانوں پر عائد ہوتی ہے اور یہ افعال اس کے حال اور مستقبل دونوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر حیات کا تسلسل یا حیات بعد الموت کا تسلیم کیا جانا لازمی ہے۔

(د) اور یہ سب کچھ اللہ پر ایمان کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ اگر خدا کو تسلیم نہ کیا جائے تو دنیا میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مستقل اقدار کا سرچشمہ کیا ہے؟ اس کا سیدھا سادا جواب ہے وحی الہی یا قرآن مجید فرقان حمید۔ اس أم الكتاب کے علاوہ آپ کو کہیں سے یہ اخلاقی اقدار مل ہی نہیں سکتیں کیونکہ انسانی فکر ان مستقل اخلاقی اقدار کا تعین نہیں کر سکتی۔ قدیم

یونان میں یہ اقدار عقل، جرأت، ضبط اور عدل تھیں۔ آج کے دور میں ہر مفکر کے نزدیک یہ الگ الگ ہیں ان میں کچھ مشترک بھی ہیں تاہم آج تک کوئی ایسی فہرست مرتب نہیں ہو سکی جسے تمام انسانیت کی مشترکہ اخلاقی اقدار کہا جاسکے اور نہ ہی کبھی ایسا ممکن بھی ہو سکے گا۔ کیونکہ اول تو اس فہرست کا تعین ممکن نہیں دوم اگر بالفرض محال ایسا ہو بھی جائے تو ان اقدار کی تعریف (Definition) ممکن نہیں ہو سکے گی۔ لہذا یہ طے ہے کہ مطلق اخلاقی اقدار صرف اور صرف خدا کی جانب سے مل سکتی ہیں اور الہامی کتابوں میں اس وقت سوائے قرآن مجید فرقان حمید کے کوئی بھی کتاب اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ہے۔ لہذا مطلق اخلاقی اقدار کا سرچشمہ صرف اور صرف یہی کتاب ہو سکتی ہے۔ اس سے ماسوا کچھ نہیں۔ اسی بنیاد پر اس طرح کے وہ تمام افکار و خیالات جنہیں وحی کی تائید حاصل نہ ہو وہ انسانوں کے من گھڑت تو ہو سکتے ہیں حق نہیں اور ان کی حیثیت تاریک بھوت سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ یہود و نصاریٰ کی بنیادی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اہل حق کو بھی ان کی ٹھوس بنیاد سے ہٹا کر ان کے اپنے لات و منات کی دنیا میں لے آئیں جس کی کوئی اساس نہیں۔ اسی طرح انہوں نے اپنے نفوس کو خود گمراہ کیا ہے اور اس کا شعور بھی نہیں رکھتے۔

یہ صورتحال صرف یہود و نصاریٰ تک محدود نہیں اس دنیائے رنگ و بو میں شیطان نے ایسے کئی دلاویز بتوں کو تراش کر انسانوں کے سامنے انہیں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ان کی کشش آفرینیا میں کھو کر حق سے گمراہ ہو گئے ہیں اور اسی سحر کو حق سمجھ بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی اسی دنیا میں مست ہیں اسی کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور اس طرح اپنے نفوس کو بدترین دھوکہ دے رہے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس کا شعور بھی نہیں رکھتے۔

یاد رکھیے حق صرف اور صرف قرآن ہے اس سے ماسوا کچھ نہیں۔ جس چیز کو قرآن حق قرار دے

صرف وہی حق ہے باقی سب دفتر بے معنی ہے جسے غرق مے ناب اولیٰ ہونا ہے۔ ایسا آج نہیں توکل ہو جائے گا اس سے مفر نہیں ہے۔ گویا قرآن کے علاوہ کسی کو معیار حق قرار دینا اپنے نفس کو دھوکہ دہی کے مترادف ہے اس طرح انسان اپنے نفس کو یہ باور کرواتا ہے کہ وہ جن باطل عقائد، تصورات، رسوم و رواج کا پیروکار ہے وہی حق ہے اور نفس اس بنیاد پر ان کی خلاف ورزی پر انسان کو ٹوکننا شروع کر دیتا ہے یہ وہ دھوکہ ہے جو انسان خود اپنے نفس کو دیتا ہے۔

يُخْلِعونَ اللّٰهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ
وَمَا يَشْعُرُونَ ○

(۲/۹)

وہ اللہ اور اہل ایمان کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں مگر اپنے نفس کے سوا کسی کو دھوکہ نہیں دیتے اور سمجھتے نہیں۔

انسان کی اس قسم کی تمام تدبیریں خود ان انسانوں کے اپنے نفس کے خلاف ہی جاتی ہیں اور انسان بے سمجھے بوجھے اس راہ پر اندھا دھند چلتا جاتا ہے۔

وَمَا يَنْكُرُونَ إِلَّا بِأَنفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ○

(۶/۱۲۳)

وہ اپنے نفس کے خلاف تدبیریں کرتے ہیں پر شعور نہیں رکھتے۔

گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ:

(۱) صرف اور صرف قرآن ہی معیار حق و باطل ہے اسی کی روشنی میں حق و باطل کا تعین ہو سکتا ہے۔ جس چیز کو قرآن نے اعمال صالح کہا صرف وہی اعمال حسنہ ہیں اور وہی افعال ظلم قرار پائیں گے جنہیں قرآن نے ظلم قرار دے دیا ہو۔

(۲) اس معیار حق (قرآن) کے علاوہ جو بھی معیار قرار دیا جائے گا وہ باطل ہوگا۔ انسان اس قسم کے معیارات متعین کر کے خود اپنے نفس کو دھوکا دیتا ہے۔ لہذا اگر

انسانی نفس باطل قسم کے معیارات میں آنکھ کھولے گا تو ان معیارات کی خلاف ورزی پر انسان کو ٹوکنا شروع کر دے گا۔ اس طرح انسان خود نفس کو اس طرح دھوکا دیتا ہے کہ اس کے سامنے باطل معیارات لا کر رکھ دیتا ہے جبکہ نفس اپنا فریضہ بہ حسن و خوبی انجام دے رہا ہوتا ہے لیکن اگر اس کے سامنے معیارات ہی غلط ہوں تو ظاہر ہے اس میں قصور نفس کا نہیں معیارات بنانے والے انسان کا ہے۔

عملی جانچ:

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن مجید کا بنیادی مخاطب انسان ہے۔ اللہ انسانوں کو راہ ہدایت دکھانا چاہتا ہے اسی وجہ سے غلط افعال کے جو منفی نتائج نفس پر مرتب ہوتے ہیں انہیں قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے جن پر آئندہ ابواب میں بحث کی گئی ہے اور ظاہر ہے یہ ایسے نتائج ہوں گے جنہیں جانچا جاسکتا ہوگا۔ انسان چونکہ محسوسات کا خوگر ہے لہذا لامحالہ یہ نتائج ایسے ہوں گے جو انسانی دائرہ احساس میں داخل ہوں گے۔ اب اگر ان منفی افعال کے اثرات کی انسانی نفس پر جانچ کی جائے تو لامحالہ نتائج وہی ہوں گے جو قرآن مجید میں بیان کیئے گئے ہیں۔ سائنس آج تک کسی قرآنی حقیقت کی تردید نہیں کر سکی ہے بلکہ الٹا قدم بہ قدم اس کی تصدیق کرتی چلی جا رہی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن منفی افعال کے جو نتائج بیان کرتا ہے وہ غلط ہوں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف انسانوں کے من گھڑت تصورات، عقائد، رسوم و رواج کی خلاف ورزی کے نتائج کی بھی نفس انسانی پر جانچ کر لی جائے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ ایک طرف خدائی احکامات کی خلاف ورزی کے نتائج سامنے آجائیں گے تو دوسری طرف انسانوں کے خود ساختہ تصورات، عقائد اور رسوم و رواج سے بغاوت کے نفس انسانی پر

اثرات کی جانچ ہو جائے گی اور ثابت ہو جائے گا صرف قرآن ہی سچ ہے باقی سب باطل ہے۔ تاہم بد قسمتی سے اس حوالے سے چونکہ کوئی تحقیق سائنسی انداز میں نہیں ہوئی ہے لہذا اس بابت عملی نتائج پیش نہیں کیے جاسکتے۔ تاہم آنے والے وقت میں جب اس حوالے سے تحقیق ہوگی تو وقت خود ہی قرآن کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کر دے گا۔ اس حوالے سے تو قرآن خود دعوت تحقیق دے رہا ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ

وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿٢١-٢٠/٥١﴾

اور زمین میں یقین رکھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں اور تمہارے اپنے نفوس میں بھی کیا تم دیکھتے نہیں۔

اور وہ وقت انشاء اللہ جلد آنے والا ہے جب وقت خود ثابت کرے گا کہ صرف قرآن ہی حق ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ

يَتَّبِعِينَ لِحُجْرَاتِهِ أَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ

عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿٥٣/٢١﴾

(٢١/٥٣)

ہم عنقریب ان کو آفاق میں اور خود ان کے اپنے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب ہر شے کا نگران ہے۔

نفسِ لوامہ اصل فریضہ نہیں بھولتا

یہاں اس حوالے سے ایک اور امر کی صراحت بھی لازمی ہے اور وہ یہ کہ کسی قسم کے باطل

معیارات کی موجودگی میں ایسا نہیں ہوتا کہ نفس کو امہ ان افعال کے خلاف جنہیں قرآن نے ظلم قرار دیا ہے اپنا روک ٹوک کا فریضہ بھول جائے ایسا نہیں ہوتا اور ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ اس صورت میں بھی جبکہ نفس تمام جگہوں سے باطل معیارات میں گھرا ہوا ہو ایسے افعال جنہیں قرآن نے ظلم قرار دیا ہے اگر انسان وہ افعال انجام دے تو نفس کا احتجاج ختم نہیں ہوتا وہ اس قسم کے افعال کے خلاف بدستور اپنا احتجاج ریکارڈ کرواتا چلا جاتا ہے۔ یعنی اس صورت میں وہ دُھرا کام کر رہا ہوتا ہے یعنی ایک طرف انسان اگر اپنے خود ساختہ معیارات کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے ٹوکتا ہے تو دوسری طرف وحی کی جانب سے دائرہ ظلم میں آنے والے افعال کی انسانوں کی جانب سے انجام دہی پر بھی انسان کو ملامت کرتا ہے۔ یاد رکھیے کوئی بھی فعل جو از روئے قرآن ظلم میں شامل ہے وہ انسانی نفس کا توازن کسی نہ درجے بگاڑتا ضرور ہے۔ اور جب یہ توازن بگڑتا ہے تو اس کا کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں اظہار ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً جھوٹ ایک فعل بد ہے۔ اس کا فوری نتیجہ بلڈ پریشر میں اضافے کی شکل میں نکلتا ہے۔ اس مظہر کی بنیاد پر اب ایسے آلات دستیاب ہیں جن کی مدد سے انسانی جھوٹ کو پکڑا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سے دیگر افعال کا معاملہ ہے۔

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

بعض اوقات یہ بیان دیا جاتا ہے کہ ایسے لوگ جو کسی منفی سرگرمی میں مسلسل ملوث رہے ہوں ان کا نفس انہیں کوئی ملامت نہیں کرتا اور وہ بغیر کسی اندرونی دباؤ کے وہ منفی سرگرمی انجام دیئے چلے جاتے ہیں مثلاً ایک کرائے کا قاتل ہے وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ اسے قتل کے کتنے پیسے مل رہے ہیں وہ صرف رقم دیکھتا ہے اور قتل یہ قتل کیئے چلا جاتا ہے یا اسی طرح کوئی چور

ہے وہ مسلسل چوری کیے چلا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ انہیں یا اس قسم کے دیگر افراد کو ان کا نفس کچھ نہیں کہتا۔

ایسا نہیں ہے بلکہ قطعی نہیں ہے۔ کوئی بھی انسان جب بھی کوئی ظلم پہلی بار کرتا ہے اسے نہ صرف اپنے نفس کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ خود اللہ تعالیٰ اسے مختلف حوالوں سے، مختلف حالات و واقعات کے ذریعے انتباہی علامات ضرور دیتا ہے شرط صرف یہ ہے کہ انسان ان انتباہات کو سمجھ لے اور باز آجائے۔ اپنے بُرے افعال پر اللہ سے استغفار کرے تو اللہ یقیناً غفور اور رحیم ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ
ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ ۗ وَمَنْ
يَعْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ
مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝

(۳/۱۳۵)

ہاں ان لوگوں کے لیے جو کسی برا کام کرنے کی صورت میں یا اپنے نفس پر ظلم کرنے کی صورت میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور استغفار چاہتے ہیں اور اللہ کے سوا کون تصور معاف کر سکتا ہے اور اپنے افعال پر دانستہ ضد نہیں کرتے۔

تاہم ان انتباہات یا اللہ کی نشانیوں اور نفس کی مزاحمت کا سلسلہ لامتناہی بہر حال نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ایک مخصوص مدت یا حد تک رہتا ہے اس کے بعد نفس کی مزاحمت ختم ہو جاتی ہے اور انسان مکمل تاریک راہوں کا مسافر بن جاتا ہے جہاں شیطان اس کا ہر وقت کا ساتھی ہو جاتا ہے۔

وَمَنْ يُعَشِّشْ عَنِ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ تُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ
لَهُ قَرِينٌ ۝

(۲۳/۳۶)

اور جو کوئی رحمن کے ذکر سے منہ موڑ لیتا ہے ہم اس پر ایک شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا ہر وقت کا ساتھی ہو جاتا ہے۔

تا آنکہ نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ قلب و نظر پر اللہ کی جانب سے پردے ڈال دیئے جاتے ہیں اور پھر واپسی کی راہیں کم و بیش مسدود ہو جاتی ہیں۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ

مَا قَدَّمَتْ يَدَاؤُنَا إِنَّا جَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي

أَذَانِهِمْ وَقُرْآنٍ تَدُّعُهُمْ إِلَى الْهُدَى فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا ۝ (۱۸/۵۷)

اور اس شخص سے زیادہ ظالم اور کون ہے جسے اسے رب کے نشانات (علامات) کے ذریعے سمجھایا گیا ہو تو اس نے اس سے منہ پھیر لیا اور جو اعمال وہ آگے کر چکا ہے اس کو بھول گیا ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے کہ اسے سمجھ نہ سکیں اور کانوں میں ثقل (پیدا کر دیا کہ سن نہ سکیں) اور اگر تم ان کو (سیدھے) راستے کی طرف بلاؤ تو بھی سیدھے راستے پر نہ آئیں گے۔

اس مرحلے کے بعد قانونِ فطرت یہ ہے کہ اللہ ایسے لوگوں پر ہر چیز کے دروازے کھول دیتا ہے یہاں تک کہ ایسے لوگوں کو مالا مال کر دیتا ہے اور جب وہ اس پر مکمل خوش ہو جاتے ہیں تو اللہ کا قانونِ مکافاتِ عمل انہیں ہر طرف سے گھیرے میں لے لیتا ہے پھر ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہوتی۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ أَبْوَابَ كُلِّ
شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِهَا أُوتُوا أَخَذْنَا لَهُمْ بَغْتَةً فَيَاذَا
هُمْ مُبْلِسُونَ ﴿٦١/٢٣﴾

(٦١/٢٣)

پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی فراموش کر دیا تو ہم نے ان پر
ہر ہر شے کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ جب ان چیزوں سے جو ان
کی دی گئی تھیں خوب خوش ہو گئے تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا اور اس وقت وہ
مایوس ہو کر رہ گئے۔

لہذا یہ کہنا کہ ایسے لوگ جو تاریک راہوں کے مسافر ہوں انہیں انکا نفس لوامہ کچھ نہیں کہتا
قطعاً غلط ہے وہ اپنا فرض بخوبی نبھاتا ہے تاہم وہاں تک جہاں تک انسان اس کی بات سننے
پر تیار ہو لیکن اگر انسان خود ہی عقل و شعور کے دروازے بند کر لے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟

ایک سطحی تضاد اور اس کا حل

اس مرحلے پر ایک سطحی تضاد کا رفع کیا جانا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ایک جانب نفس امارہ ہے
جو انسانوں کو برائی کی جانب راغب کرتا ہے اور دوسری جانب نفس لوامہ ہے جو انسانوں کو
برائیوں کی جانب رغبت پر ٹوکتا اور احساس ندامت پیدا کرتا ہے۔ ایک ہی نفس کے دو
مختلف بلکہ متضاد کردار کیسے ہو سکتے ہیں؟

یہ تضاد دراصل صورت حال کو سطحی انداز میں لینے سے پیدا ہوتا ہے نفس امارہ اگر ایک طرف
برائی کی جانب راغب کرتا ہے تو یہ اس کی فطرت نہیں بلکہ اس کا یہ عمل صرف اس وقت ہوتا
ہے جب انسان اپنے اعمال بد کے نتیجے میں اللہ کی رحمت کا سزاوار نہیں رہتا اور نہ اگر اللہ کی
رحمت شامل حال ہو تو نفس امارہ کا منفی کردار انسان کے تابع رہتا ہے۔ اس کی وضاحت
سورۃ الیوسف کی مندرجہ ذیل آیت سے ہوتی ہے

وَمَا أُبْرِي نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ

إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ (۱۲/۵۳)

میں اپنے نفس کی پاکیزگی بیان نہیں کرتا بے شک نفس تو برائی پر ابھارنے والا ہی ہے ماسوا اس کے کہ میرا رب ہی اپنا رحم کرے یقیناً میرا رب غفور اور رحیم ہے۔

یہ قول جس کی تردید پورے قرآن مجید میں کہیں نہیں کی گئی اس امر پر شاہد ہے کہ نفس امارہ اس وقت برائیوں پر ابھارتا ہے جب اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہو۔ اگر اللہ کی رحمت شامل ہو تو ظاہر ہے نفس امارہ انسان کو ورغلا نہیں سکتا۔ اللہ کی رحمت ہر حال میں شامل حال ہوتی ہے تاہم جیسا کہ عرض کیا گیا اگر انسان خود ہی ایسا نہ کرنا چاہے اور خود اس کی رحمت سے منہ موڑ کر شیطان کا ہمقدم بن جائے تو اللہ یقیناً تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ اس کی رحمت انہی کے شامل حال ہوتی ہے جو خود ایسا چاہیں جو خود ہی نہ چاہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ نفس کا منفی کردار (نفس امارہ) اس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان خود اسے ایسا کرنے کی اجازت دے اور شیطان کا ساتھی بنا چاہے تو نفس اسے اس سمت لے جاتا ہے۔

لہذا یہ کہنا کہ نفس امارہ یا نفس لوامہ باہم متضاد کیفیتیں ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ یہ تضاد صورت حال کو سطحی انداز میں لینے سے پیدا ہوتا ہے ورنہ درحقیقت نفس کا کردار تعمیر اور مثبت ہے۔

نفس مطمئنہ

نفس انسانی کی یہ تیسری کیفیت ہے بلکہ اسے کیفیت کی بجائے درجہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ وہ صورت حال ہوتی ہے جب انسان اپنے رب سے اور اس کا رب اپنے بندے سے راضی ہو جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝

ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝

فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝

وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝

(۸۹/۲۷-۳۰)

اے اطمینان والے نفس! لوٹ چل اپنے رب کی طرف وہ تجھ سے راضی تو اس سے راضی پس داخل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

نفس مطمئنہ سے مراد تسکین قلب کی ایسی کیفیت ہے جو علم و فکر، دلائل و براہین اور مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہو۔ قرآن مجید میں اطمینان قلب کو اکراہ کی ضد قرار دیا ہے۔ اکراہ کے معنی زبردستی اور جبر کے ہیں۔ اس کی وضاحت سورۃ النحل کی مندرجہ ذیل آیت سے ہوتی ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيْمَانِهِ إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ

مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيْمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا

فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۱۶/۱۰۶)

جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے بجز اس کے کہ جس پر جبر کیا جائے

اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو مگر جو لوگ کھلے دل سے کفر کریں تو ان پر اللہ کا

غضب ہے اور انہی کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

اس کی مزید صراحت سورۃ البقرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اللہ سے گفتگو کے حوالے

سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے کہا مجھے بتا کہ تو مردوں کو کس

طرح زندہ کرتا ہے؟ اللہ نے کہا کیا تیرا اس پر ایمان نہیں؟ انہوں نے جواب دیا ایمان تو ہے

لیکن میں اپنے دل کا اطمینان چاہتا ہوں (۲/۲۶۰)۔ بالفاظ دیگر اطمینان قلب یا تسکین

قلب کی ایک ایسی کیفیت جو علی وجہ البصیرت ہو۔ اس بنیاد پر نفس مطمئنہ سے مراد ایمان کا دل

کی کامل رضامندی سے ماننا ہے جس میں کسی قسم کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ جب اللہ پر ایمان کی یہ کیفیت ہوگی تو لامحالہ احکام الہی کی اطاعت و فرماں برداری بھی اپنے کمال پر ہوگی۔ کیونکہ انسان مکمل ایمان کیساتھ احکام الہی کی کامل تابعداری کر رہا ہوگا اور احکام الہی کی اطاعت کا لازمی نتیجہ وہ جنت ہے جس کا اس قسم کے قلب سلیم کے حامل نفوس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ ایمان کامل اور اطاعت کی وہ آخری منزل ہے جس حد تک کوئی انسان جاسکتا ہے۔

۱۰۔ انسانی موت و حیات انسانی شخصیت کے دونوں اجزاء کی علیحدگی اور ملاپ کا نام ہے

گذشتہ مباحث میں یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ از روئے قرآن انسانی شخصیت دو (۲) اجزاء کا مجموعہ ہے۔ اس امر کیساتھ یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھیے کہ قرآن مجید ہی کی رو سے موت ان اجزاء کی علیحدگی کا نام ہے۔ بالفاظ دیگر جب یہ اجزاء باہم ملتے ہیں تو حیات جنم لیتی ہے اور جب انہیں علیحدہ علیحدہ کر دیا جاتا ہے تو انسانی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کا سادہ سا ثبوت سورۃ التکویر کی مندرجہ ذیل آیات سے ملتا ہے۔

وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝	إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝
وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۝	وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۝
وَإِذَا الْمَوْءِدَةُ سُيِّتَتْ ۝	وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝
بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝	وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝
وَإِذَا الصُّعْفُ نُشِرَتْ ۝	وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۝

جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور جب تارے بے نور ہو جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے جب بیانے والی اونٹیاں بے کار ہو جائیں گی اور جب وحشی جانور جمع کیئے جائیں گے جب دریا آگ ہو جائیں گے جب نفوس کے جوڑے ملا دیئے جائیں گے اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنا دی گئی ہو پوچھا جائے گا کہ وہ کسی گناہ پر ماری گئی اور جب اعمال کے دفتر کھولے جائیں گے۔

ان آیاتِ کریمہ کا تذکرہ بعنوان 'انسانی شخصیت دو اجزاء کا مرکب ہے' کے تحت کیا جا چکا ہے وہاں مدارِ بحث یہ نکتہ تھا کہ انسان دو اجزاء کا مرکب ہے تاہم یہاں یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ یہ آیات اس امر پر بھی شاہد ہیں کہ انسانی موت انہی اجزاء کی علیحدگی اور حیات انہی کے ملاپ کا نام ہے۔ اس مقصد کے لیے پہلے متذکرہ بالا سورۃ کی ابتدائی چھ آیات پر غور کیجئے یہ آیات قیامت کے مختلف مناظر کے بیان پر مشتمل ہیں۔ جن میں زمین اور آسمان کی تباہی کا تذکرہ کیا گیا ہے ظاہر ہے اس وقت زمین پر حیات مکمل طور پر ختم ہو چکی ہوگی تاہم مقامِ تدبیر یہ ہے کہ ساتویں آیت میں انسانی نفوس کے اجزاء کے باہم ملانے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور نفوس کے باہم ملاپ کے بعد یعنی انسانوں کو حیات دینے کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ اعمال کے دفتر کھولے جائیں گے اور اس لڑکی سے جو بے گناہ ماری گئی ہو پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے تحت ماری گئی بالفاظِ دیگر سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوگا۔ سوال جواب ظاہر ہے زندوں سے کیئے جاتے ہیں مردوں سے نہیں۔ تاہم اصل نکتہ یہ ہے کہ قرآن پہلے نفوس کے اجزاء کو باہم ملانے کا تذکرہ کرتا ہے یعنی انسانوں کو حیات دینے کا پھر سوال جواب اور جواب وہی کے عمل کی بات کی جاتی ہے۔ اس سے سیدھا سا نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ حیات اسی وقت جنم لیتی ہے جب انسانی شخصیت یہ دونوں اجزاء باہم ملتے ہیں موت سادہ

طور پر ان کی علیحدگی کا نام ہے۔

اس دعویٰ کے حق میں مزید ثبوت سورۃ الزمر کی آیت ۴۲ سے ملتا ہے جہاں ارشاد ربانی ہے۔

اللَّهُ يَنْوِقِي الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ
تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ
الْآخَرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٣٩/٤٢﴾

اللہ ہی موت کے وقت نفوس کو وقات دیتا ہے جن کی موت نہیں آئی (ان کے نفوس) نیند کے وقت روک لیتا ہے پھر جن کی موت کا حکم دیا ہوا نہیں تو روک لیتا ہے اور دوسروں کو ایک مقررہ وقت کے لیے چھوڑ دیتا ہے غور کرنے والوں کے لیے اس میں یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔

اس آیت کریمہ کی رو سے انسانوں کی نیند کے وقت ان کے نفوس روک لیے جاتے ہیں۔ اس سے مراد انسانی شعور یا انسان کی شعوری کیفیت ہے۔ ایسے لوگ جن کی موت کا مشیت ایزدی کے تحت فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے ان کے نفوس واپس نہیں کیے جاتے اور ان کی طبعی موت (Physical Death) واقع ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر انسانی شعور اور اللہ کے عطا کردہ نفس میں علیحدگی واقع ہو جاتی ہے۔ یعنی انسانی شخصیت کے دونوں اجزاء کے مابین تاقیامت علیحدگی ہو جاتی ہے۔ تاہم ایسے انسان جن کی موت کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا ہوتا (ان کے نفوس) یعنی انسانی شعور ایک مقررہ وقت کے لیے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر دونوں حصوں کا پھر باہم ملاپ ہو جاتا ہے جس سے انسان وہ تمام افعال انجام دینے لگتا ہے جو زندگی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

موت کا اطلاق چونکہ نیند پر بھی ہوتا ہے لہذا اس حوالے سے یہ امر واقع ہے کہ نیند کے

دوران اس آیت کریمہ کی رو سے نفس انسانی (انسانی شعور) اللہ تعالیٰ روک لیتا ہے اور انسان موت سے ملتی جلتی کیفیت میں آجاتا ہے اور جب اذن خداوندی سے نفس واپس مل جاتا ہے تو حیات بھی واپس آجاتی ہے۔ اس مثال کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ کس طرح انسانی حیات نفوس کے زوج سے جنم لیتی ہے اور علیحدگی سے موت واقع ہو جاتی ہے۔

اس کی سادہ سی مثال بیٹری کی مدد سے دی جاسکتی ہے جس طرح بیٹری مثبت اور منفی کرنٹ کی مدد سے ورکنگ میں آتی ہے جب تک یہ دونوں طرح کے کرنٹ موجود رہتے ہیں یا ان کی رسد بحال رہتی ہے بیٹری کام کرتی رہتی ہے تاہم اگر بیٹری سے اگر ایک مخصوص عرصے تک کام نہ لیا جانا مقصود ہو تو اس کے مثبت ٹرمینل سے تار علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں اس صورت میں بیٹری ختم نہیں ہو جاتی وہ بدستور زندہ ہوتی ہے لیکن ورکنگ میں نہیں ہوتی بعینہ یہی صورت حال انسان کی نیند کے وقت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ انسانی شخصیت کا زیادہ طاقتور حصہ انسانی شعور روک لیتا ہے اور بیٹری کی طرح انسان بھی مر نہیں جاتا وہ بھی زندہ ہوتا ہے لیکن بیٹری کی طرح ورکنگ میں نہیں ہوتا۔

۱۱۔ موت کے وقت فرشتہ اجل انسانی شخصیت کے دونوں اجزاء پر قبضہ کر لیتا ہے از روئے قرآن موت کے وقت موت کا فرشتہ انسانی شخصیت کے دونوں اجزاء (دونوں نفوس) کو قبضے میں لے لیتا ہے اس حقیقت کا اثبات سورۃ السجدہ کی مندرجہ ذیل آیت سے ہوتا ہے۔

قُلْ يَتُوفَكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي نُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ

إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿٣٢/١١﴾

(۳۲/۱۱)

کہہ دیجئے کہ تم کو موت کا فرشتہ پورے کا پورا قبضہ میں لے گا جو تم پر مقرر ہے پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

متذکرہ بالا آیت (۳۲/۱۱) میں لفظ 'یتوفکم' خصوصی تدبر کا محتاج ہے۔ اس کا مادہ وفی ہے جس کے بنیادی معنی کسی چیز کے مکمل ہونے، پورے ہونے کے آتے ہیں۔ سورۃ آل عمران میں وفیت کا لفظ لا یظلمون کے مقابل آیا ہے (۳/۲۴) یعنی کم نہ ہونا، پورا پورا مل جانا۔ سورۃ ہود میں بھی اسے انہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جہاں اسے بلا کسی قسم کی کمی کیئے ہوئے پورا دے دینے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے (۱۱/۱۰۶)۔ سورۃ نحل میں اسے تکمیل تک پہنچانے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ جہاں کہا گیا کہ "اللہ تمہیں پیدا کرتا ہے پھر تمہاری جسمانی ساخت کو تکمیل تک پہنچا دیتا ہے" (۱۶/۷۰)۔ اسے موت کے معنی میں سورۃ الانعام میں استعمال کیا گیا ہے جہاں کہا گیا کہ "یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے فرشتے اسے موت دیتے ہیں" (۶/۶۱)۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو جاتے ہیں۔ اس بنیاد پر متذکرہ بالا آیت (۳۲/۱۱) کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "کہہ دیجئے کہ تم کو موت کا فرشتہ موت دے گا جو تم پر مقرر ہے پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے"۔ تاہم متذکرہ بالا ترجمہ اس لیے زیادہ قرین قیاس ہے کہ انسانی موت کے وقت اس کی شخصیت کے دونوں اجزاء کی موت واقع ہوتی ہے لہذا موت کا فرشتہ اس کے دونوں اجزاء کو اپنے قبضے میں لیتا ہے۔ بالفاظ دیگر پورے کا پورا قبضے میں لیتا ہے۔ اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ روز قیامت

انہی دونوں اجزاء کے دوبارہ ملاپ سے پھر حیات دوبارہ جنم لے گی۔ لہذا موت کا فرشتہ دونوں اجزاء کو یا پوری کی پوری انسانی شخصیت (دونوں نفوس) کو اپنے قبضے میں لیتا ہے جنہیں روز قیامت دوبارہ باہم ملا دیا جائے گا۔

اس امر کی تصدیق سورۃ الاحزاب کی آیت ۱۹ سے بھی ہوتی ہے جہاں موت کے لیے یغشی علیہ من الموت (۳۳/۱۹) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ان الفاظ میں لفظ یغشی خصوصی تدبیر کا محتاج ہے۔ اس کا مادہ غ ش ی ہے جس کی معنی ہیں کسی شے کو پوری طرح ڈھانپ لینا یا اس پر بالکل چھا جانا۔ سورۃ الاعراف میں اسے ڈھانپ لینے (تغشھا) (۷۱/۸۹) اور سورۃ النوح میں دلوں کو ڈھانپ لینے یا غلافوں میں بند کر لینے (واستغشو) (۷۱/۷۱) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح غشاوۃ بمعنی پردہ (۳۱/۷۱) ڈھانپ لینے (غشی) (۲۰/۷۸)، ہر طرف سے چھا جانے والی مصیبت (الغاشیہ) (۸۸/۱)، ہمہ اطراف سے محیط محیطۃ (۹/۴۹) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں (۳۳/۱۹) میں یغشی علیہ من الموت سے مراد ”موت کی وجہ سے اس پر چھا جانے والا پردہ“ ہوگا جس میں پورا نفس انسانی ڈھانپ لیا گیا ہو یا کسی غلاف میں بند کر لیا گیا ہو اس طرح موت پورے نفس انسانی پر محیط ہوتی ہے اور ملک الموت نفس انسانی کے دونوں اجزاء کو اپنے مکمل قبضے میں لے لیتا ہے۔

۱۲۔ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ

(۳/۱۸۵)

ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

اس حقیقت کا اعادہ (۲۱/۳۵) اور (۲۹/۵۷) میں انہی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ موت کیا ہے؟ اس کا جواب از روئے قرآن تو یہی ہے۔ انسانی شخصیت کے دونوں اجزاء کی علیحدگی۔ اس کا اختیار ظاہر ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے پاس ہرگز نہیں۔

موت و حیات دو باہم متضاد چیزیں ہیں

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ
يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ

(۲/۲۸)

تم اللہ سے کیسے منکر ہو سکتے ہو اس نے تمہیں موت سے حیات بخشی وہی تم کو موت دیتا ہے پھر وہی تم کو زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

حیات زندگی کا دوسرا نام ہے۔ زندگی اپنی مختلف علامات سے پہچانی جاتی ہے اس کی پہلی علامت قوت نامیہ ہے۔

إِذْ عَلَّمْنَا إِنْ اللَّهُ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّهُمْ لَبِينُونَ
لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ

(۵۷/۱۷)

اور جان رکھو کہ اللہ ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے ہم نے اپنی نشانیاں تم سے کھول کر بیان کر دی ہیں تاکہ تم سمجھو۔

زندگی کی علامات میں سے دیگر علامت سکڑنا ہے جو درحقیقت حیات کے جذبہء تحفظ خویش (Preservation of Self) کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قوت حاسہ (Faculty of Sensation) اور قوت فکر و عمل (سوچنے سمجھنے کی صلاحیت) سے بھی حیات کا اظہار ہوتا ہے۔

أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي
بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ
مِنْهَا كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ (٦/١٢٢)

بھلا جو شخص پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لیے روشنی کر دی جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کہیں اس شخص ایسا ہو سکتا ہے جو اندھیرے میں پڑا ہو اور اس سے نکل ہی نہ سکے اس طرح کافر جو عمل کر رہے ہیں وہ انہیں اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

اس طرح حیات سے مراد عقل سلیم بھی ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بھی حیات ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا
دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ

(٨/٢٤)

اے اہل ایمان! اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو وہ تم کو حیات بخش امور کی طرف بلا تے ہیں۔

حیات کی ایک قسم وہ ہے جو صرف اللہ کی ذات کے لیے مختص ہے یعنی حیاتِ جاودانی۔ موت درحقیقت حیات کی انہی صفات سے محرومی کا نام ہے۔ موت کا لفظ سکون اور جمود کے لیے

استعمال کیا جاتا ہے۔ نیند پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں موت کا لفظ صرف حیات کی خصوصیات سے محرومی (عام انسانوں کی طبعی موت) کے لئے ہی استعمال نہیں کیا گیا بلکہ عقل و شعور سے محرومی اور اقوام کی اجتماعی موت اور دیگر حوالوں سے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ تاہم موضوع زیر بحث کے حوالے سے موت کے صرف اس پہلو کو زیر بحث لایا گیا ہے جسے نفوس کی طبعی موت کہا جاتا ہے۔ لہذا جب قرآن مجید فرقان حمید یہ کہتا ہے کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے تو اس سے مراد ہر انسان کی طبعی موت ہے جس سے کوئی مفر نہیں ہے۔

۱۳۔ کوئی نفس اللہ کے اذن کے بغیر مر نہیں سکتا

جہاں ایک طرف انسانی موت ایک ناقابل تردید حقیقت ہے تو دوسری طرف یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ کوئی نفس اللہ کے حکم کے بغیر مر نہیں سکتا۔ بالفاظ دیگر انسانی شخصیت کے ان دونوں اجزاء کی علیحدگی کا حکم صرف اور صرف اللہ کی جانب سے آ سکتا ہے جب اللہ یہ حکم دیتا ہے تو یہ علیحدگی ہو جاتی ہے اگر اس کا اذن نہ ہو تو یہ امر کسی صورت ممکن نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا (۳/۱۴۵)

اور کسی نفس میں یہ طاقت نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے (یہ صرف اس کے طبعی قانون کے مطابق آتی ہے۔)

اللہ اور نفس انسانی کا باہمی تعلق

جہاں تک اللہ تعالیٰ اور نفس انسانی کا باہمی تعلق ہے اللہ تعالیٰ چونکہ خالق کائنات ہے لہذا

۱۔ وہی ہر نفس پر نگراں بھی ہے

۲۔ اس نے نفسِ انسانی میں اپنی آیات / نشانیاں رکھی ہیں اور

۳۔ انسانی نفس کو وہ بخوبی جانتا ہے۔

ان نکات کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ اللہ ہر نفس پر نگران ہے

قطع نظر اس کے کہ کون اللہ کی حقانیت کا اعتراف کرتا ہے اور کون انکار اللہ تعالیٰ خالق کائنات اور تمام مخلوقات کے خالق کی حیثیت سے ہر نفس کے کسبِ کانگراں ہے۔

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ

(۱۳/۳۳)

تو کیا جو (اللہ) ہر نفس کے اعمال کا نگران ہے وہ بتوں کی طرح بے علم (و بے خبر) ہو سکتا ہے۔

اسی سورۃ میں آگے چل کر خدائے علیم و حکیم کا ارشاد پاک ہے

يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ

(۱۳/۳۲)

وہ ہر نفس کے کسب کا مکمل علم رکھتا ہے۔

ظاہر ہے یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں اللہ جو تمام جہانوں کا خالق ہے ظاہر ہے صرف وہی ہر نفس کے کسب / اعمال کا نگران ہو سکتا ہے اور ان کا مکمل علم رکھ سکتا ہے یہ کسی اور کے بس کی بات ہی نہیں۔

۲۔ نفسِ انسانی میں اللہ کی آیات

وہی ذاتِ بابرکات جو نفسِ انسانی کا خالق اور نگران ہے اس نے جہاں اس پوری کائنات کو اپنی

لا تعداد نشانیوں سے مزین کیا ہے۔ اسی نے انسانی نفس میں بھی اپنی نشانیاں عطا کی ہیں۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ
يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنََّّهُ الْحَقُّ ۚ أَوْلَمْ يُكْفِ بِرَبِّكَ أَنْتَهُ
عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝

(۴۱/۵۳)

ہم عنقریب ان کو آفاق میں اور خود ان کے اپنے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب ہر شے پر نگران ہے

وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں اور انفس و آفاق پر تدبر کرتے ہیں ان کے لیے زمین اور خود ان کے نفوس میں اللہ کی آیات بکھری ہوئی ہیں صرف دیکھنے والی نظر چاہئے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ ۝

(۵۱/۲۰-۲۱)

وَفِي أَنْفُسِكُمْ دَافِلَاتٌ لِّتُبْصِرُوا ۝

اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں اور خود

تمہارے نفوس میں (بھی) تو تم تدبر و تفکر کیوں نہیں کرتے؟

جہاں تک انسانی نفس سے متعلق علم یعنی علم النفسیات کا تعلق ہے اس نے بیسویں صدی میں تو آنکھ کھولی ہے جوں جوں اس حوالے سے تحقیقات آگے بڑھیں گی انسانی نفس میں اللہ کی آیات سامنے آتی چلی جائیں گی۔

۳۔ اللہ انسانی نفس کو بخوبی جانتا ہے

اللہ جس نے یہ تمام کائنات اور تمام مخلوقات کو خلق کیا ہے ظاہر ہے اس سے بہتر انسانی نفس کو کون جان سکتا ہے

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ

(۲/۲۳۵)

جان رکھو کہ جو کچھ تمہارے نفوس میں ہے وہ اس کا علم رکھتا ہے

اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل میں ارشادِ بانی ہے۔

رَبِّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ

(۱۷/۲۵)

جو کچھ تمہارے نفوس میں ہے تمہارا رب اس کا علم رکھتا ہے۔

نفس کی اصطلاح اللہ کی ذات کے حوالے سے

قرآن مجید میں نفس کی اصطلاح اللہ تعالیٰ کے حوالے سے بھی استعمال کی گئی ہے لیکن ظاہر ہے جب نفس کی اصطلاح اللہ تعالیٰ کے حوالے سے استعمال کی جائے گی تو اس کے معنی انسانی نفس سے بالکل جدا گانہ ہوں گے وہ مکمل، یگانہ اور کامل ترین ہستی ہے اس کے حوالے سے اس قسم کا کوئی تصور ممکن نہیں جو انسانوں کے حوالے سے ہے۔ لہذا جب قرآن مجید میں یہ اصطلاح اللہ تعالیٰ کے حوالے سے آئے گی تو اس سے مراد خود اللہ تعالیٰ کی اکمل ترین اور جامع الصفات ہستی ہوگی جو خود قائم بالذات ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس تناظر میں قرآن مجید کی ان آیات پر تدبر لازمی ہے جن میں اللہ کی ذات کے حوالے سے نفس کا تذکرہ کیا گیا ہے مثلاً سورۃ ال عمران میں ارشادِ بانی ہے

وَيُحَذِّرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ

(۳/۲۸)

اللہ تمہیں اپنے آپ سے یا اپنی ذات سے ڈراتا ہے

بالفاظِ دیگر اللہ تمہیں قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے مرتب ہونے والے منفی نتائج سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔ وہ سرِ ایا رحمت ہے

كُتِبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ ۝

(۶/۱۲)

اللہ نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

اس حقیقت کا اعادہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

كُتِبَ رَبِّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ ۝

(۶/۵۴)

اللہ نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

لہذا جب اللہ کی ذات کے غضب کا حوالہ دیا جاتا ہے تو اس سے مراد اللہ کی اپنی مشیت سے طے کردہ قوانین کی خلاف ورزی کے منفی نتائج ہیں۔ جن سے وہ انسانوں کو متنبہ کرتا ہے ورنہ وہ خود تو سرِ ایا رحمت ہے اور خود اپنی مشیت سے اس نے اپنے اوپر رحمت کو فرض کر لیا ہے لہذا ہر لمحہ اس کی رحمت طلب کی جانی چاہیے اور قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے رہنا چاہیے۔

انسانی افعال اور نفس

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ از روئے قرآن انسان اپنے نفس پر قادر ہے اور وہ جو بھی افعال انجام دیتا ہے اس کا اثر براہ راست اس کے نفس پر پڑتا ہے۔ اس حوالے سے بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان کی تمام سعی و جدوجہد اس کے اپنے نفس کی خاطر ہوتی ہے۔

انسانی سعی کا محور اس کا اپنا نفس ہوتا ہے

از روئے قرآن جملہ انسانی افعال اور انسان کی ہر قسم کی جدوجہد، سعی و کوشش کا محور اس کا نفس ہوتا ہے۔ یہ اساسی کلیہ سورۃ العنکبوت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ

عَنِ الْعَالَمِينَ ○

(۲۹/۶)

اور جو کوشش کرتا ہے تو وہ صرف اپنے نفس کے لئے کوشش کرتا ہے بے شک اللہ

تمام عالمین سے بے نیاز ہے

تمام نوع انسانی کے لئے یہ کلیہ قرآن مجید کی اساسی تعلیمات میں سے ایک ہے۔ ہر انسان

خواہ وہ کوئی ہو، کہیں رہتا ہو، وقت کے کس لمحے میں زندہ ہو ان تمام امور سے قطع نظر اس کی

تمام سعی اور جدوجہد کا محور صرف اور صرف اس کا نفس ہوتا ہے۔ انسان جو بھی فعل انجام دیتا

ہے خواہ وہ اچھا ہو یا برا اس کے اثرات اس کے نفس پر مرتب ہوتے ہیں۔ افعال تو درکنار

اس کا رگہ حیات میں جو خیالات بھی انسانی دماغ میں آتے ہیں وہ بھی اپنے اثرات مرتب

کرتے ہیں۔

لے سانس بھی آہستہ کہ ہے نازک بہت کام
کارگہ عالم کی اس شیشہ گری کا

یہ کارگہ عمل انسانوں کے لیے سجائی گئی ہے انسان خود ہی اپنے تمام افعال کا ذمے دار ہے اللہ
احتیاج کے تصور سے ہی ماوراء ہے وہ اس تمام عالم سے بے نیاز ہے انسان اس کے محتاج ہیں
وہ خود کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ قائم بالذات ہستی ہے جو اپنی ہستی، بقا اور استحکام کے لئے کسی
خارجی سہارے کی محتاج نہیں ہے۔ ایک مکمل اور اکمل ترین ہستی۔ جس کی طرف انسان اپنی
مشکلات، پریشانیوں اور مصائب میں رجوع کرتا ہے تاہم وہ خود بے نیاز ہے۔

اس بنیاد پر بنیادی اصول یہ ٹھہرا کہ تمام انسانی افعال بغیر کسی استثناء کے حتیٰ کہ اس کے دماغ
میں آنے والے خیالات بھی اس کے نفس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسانی افعال بنیادی طور پر
دو طرح کے ہوتے ہیں اول اعمالِ صالح دوم اعمالِ بد۔ اعمالِ صالح سے انسانی نفس کی نشوونما
ہوتی ہے اور اس کا توازن مستحکم ہوتا ہے جبکہ اعمالِ بد سے یہ صورتِ حال الٹ جاتی ہے۔

اس باب میں ان آیاتِ قرآنی سے بحث کی جائے گی جن میں انسانی افعال کے نفس پر
اثرات بیان کئے گئے ہیں۔ اس حوالے سے سب سے بنیادی اصول یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کا
فائدہ نفس کو ہوتا ہے اور برے اعمال کا عذاب بھی اسی کو بھگتنا ہوگا۔

اعمال صالحہ نفس کیلئے منفعت بخش اور اعمال بد نفس کیلئے ضرر رساں ہوتے ہیں

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ
وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ۝ (۴۱/۴۶)

جو عمل صالح کرے گا تو اپنے نفس کے لیے اور جو بدی کرے گا اس کا وبال اسی پر

پڑے گا اور تیرا رب اپنے بندوں کے لیے مطلق ظالم نہیں ہے۔

سورۃ الجاثیہ میں ارشادِ ربانی ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ، وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا
ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ۝ (۴۵/۱۵)

جو اعمال صالح کرے گا تو اپنے نفس کے لیے اور جو بُرے کام کرے گا اس کا

ضرر اسی کو ہوگا پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اسی اصول کو سورۃ الروم میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ، وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا نَفْسِهِمْ
يَهْتَدُونَ ۝ (۳۰/۴۴)

جس نے کفر کیا اس کے کفر کا وبال اسی پر ہوگا اور جس نے عمل صالح کیا تو ایسے

لوگ اپنے نفوس کے لئے ہی نفع کا سامان کر رہے ہیں۔

یہ ایک عمومی اصول ہے جس سے استثنیٰ کسی کو بھی حاصل نہیں ہے تاہم متذکرہ بالا آیت

(۳۰/۲۴) سے متصل اگلی آیت میں صریحاً واضح کر دیا گیا کہ جزا ان لوگوں کو ملے گی جو ایمان کیساتھ اعمالِ صالح کرتے ہیں اور اللہ کفار کو پسند نہیں کرتا۔

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ
إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝

(۳۰/۲۵)

تاکہ اللہ ان لوگوں کو اپنے فضل سے جزا دے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اعمالِ صالح کئے اور اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اس حوالے سے کلیئے کی شکل میں یہ اصول سورۃ الانعام کی مندرجہ ذیل آیت میں بین انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ، فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ،
وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا، وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِخَفِيظٍ ۝

(۶/۱۰۴)

تمہارے رب کی طرف سے دلائل آچکے ہیں پس جس نے انہیں جان لیا اس کا یہ فعل اس کے اپنے نفس کے لئے ہوگا اور جس نے گمراہی اختیار کی اس کا وبال اسی پر ہوگا اور میں تمہارا محافظ نہیں ہوں۔

اس آیت میں واضح اور بین انداز میں اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ خالق دو جہاں کی طرف سے ہدایت قرآن مجید فرقان حمید کی شکل میں آچکی ہے جو منبج رشد و ہدایت اور مجموعہ دلائل ہے جو انسان چاہے اس منبج فیض سے ہدایت حاصل کر سکتا ہے اگر وہ ایسا کرتا ہے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کے نفس کو ہوگا اور جو ایسا نہ کرنا چاہے اس کا وبال اسی پر ہوگا۔ اب یہ انسان کا اپنا اختیار و ارادہ ہے کہ وہ کونسی راہ اختیار کرنا چاہتا

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں راہیں اس پر کھول کر بیان کر دی ہیں انسان جو راہ اختیار کرے گا ویسی ہی تقدیر اس پر منطبق ہو جائے گی۔ انسان راہ کے انتحالی میں تو آزاد ہے۔ ایک خاص راہ پر ایک مخصوص حد تک چلنے کے بعد واپسی کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہیں لیکن جب اس راہ کے مکافات عمل کا عمل شروع ہو جائے تو پھر رجوع کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے پھر صرف نتائج کا سامنا کرنا رہ جاتا ہے۔

اس حوالے سے یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اس حوالے سے بیشتر آیات میں خطاب پوری نوع انسانی سے ہے کیونکہ نفس کی دولت ہر انسان کو بغیر کسی استثناء کے عطا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اس حوالے سے بیشتر آیات میں انسانی افعال کے نتائج اس کے نفس پر بیان کرتے وقت خطاب بنی نوع انسانی ہے کسی خاص فرد یا گروہ انسانی سے نہیں مثلاً:

تمہیں جو بھی تکلیف آتی ہے وہ نفس کی بدی کی وجہ سے ہے۔ (۳/۱۶۵)

تم نے اپنے نفوس کو خود عذاب میں ڈالا۔ (۵۷/۱۴)

نفس پر جو بھی مصیبت آتی ہے طے شدہ قانون کے مطابق آتی ہے (۵۷/۲۲)

جو بھلائی اپنے نفس کے لئے بھیجو گے اسے اللہ کے یہاں پالو گے۔ (۷۳/۲۰)

نا فرمانی کا نتیجہ اپنے نفس پر ظلم ہے۔ (۲/۵۷)

لوگ خود اپنے نفوس پر ظلم کرتے ہیں۔ (۱۰/۴۴)

اللہ کی حدود توڑنا نفس پر ظلم ہے۔ (۶۵/۱۱)

جو پاک ہوتا ہے وہ اپنے نفس کے لئے ہوتا ہے۔ (۳۵/۱۸)

جو خدا کے لئے جدوجہد کرتا ہے وہ اپنے نفس کے لئے کرتا ہے۔ (۲۹/۶)

شکر کا نتیجہ نفس کی بہتری ہے ناشکری کی صورت میں اللہ بے نیاز ہے۔

(۳۱/۱۲) (۲۷/۴۰)

ہر نفس دیکھ لے کہ اس نے آگے کے لئے کیا بھیجا ہے۔ (۵/۸۰)
 ہدایت سے نفس کو فائدہ ہوتا ہے۔ (۳۹/۴۱)، (۲۷/۹۲)، (۱۷/۱۵)، (۱۰/۱۰۸)
 بدی نفس پر ظلم ہے۔ (۴/۱۱۰-۱۱۱)

نہ صرف مندرجہ بالا آیات بلکہ اس حوالے سے قرآن مجید کی دیگر متعدد آیات بھی پیش کی جاسکتی ہیں جو صریحاً اور دو ٹوک انداز میں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ انسان جو افعال انجام دیتا ہے اس کا نتیجہ اس کے نفس پر مرتب ہوتا ہے۔ اچھے افعال / اعمال صالحہ سے نفس کا توازن مستحکم ہوتا ہے اور برے افعال سے اس کا توازن برباد ہو جاتا ہے اور وہ تباہی کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ یہاں تک ممکن ہے کہ وہ مکمل طور پر ہلاک ہو جائے۔ اس حوالے سے قرآن مجید میں متعدد افعال کا تذکرہ کیا گیا ہے جو نفس کی ہلاکت پر منتج ہوتے ہیں۔ ان افعال پر اسی باب میں آگے "نفس کی ہلاکت" کے عنوان کے تحت بحث کی گئی ہے۔

علتِ تخلیق ارض و سما

قرآن مجید کے رو سے ارض و سماوات کی تخلیق ہی اس لئے کی گئی ہے کہ ہر نفس اپنے کسب کا بدلہ پائے۔

وَ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ
 كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○ (۲۵/۲۲)

اللہ نے ارض و سماوات کو بالحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر نفس اپنے کسب کا بدلہ پائے اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جن و انس کی تخلیق کا مقصد ہی قوانین خداوندی کی اطاعت بتایا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝

ہم نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ (۵۱/۵۶)

بالفاظ دیگر جن وانس کی تخلیق کا مقصد ان احکام الہی کی اطاعت ہے جو قرآن مجید فرقان حمید میں دیئے گئے ہیں۔ یہ کائنات خالق کائنات نے اس طرح تخلیق کی ہے کہ جو بھی جیسا بھی فعل کرے گا اسے اس کا ویسا ہی نتیجہ مل جائے گا۔ اچھے اعمال / اعمال صالح کے اچھے نتائج مرتب ہوتے ہیں اور برے اعمال کے برے نتائج خود بخود سامنے آنے لگتے ہیں۔ یہ ایک ایسی روزمرہ کی حقیقت ہے جو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ بے شمار واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں جہاں قطعی واضح طور پر افعال کے نتائج خود پکار پکار کر اپنے کرنے والے اور صاحبِ بصیرت لوگوں کے لئے عبرت کا سامان پیدا کرتے ہیں لیکن انسان کی یہ حیثیت نوع غالباً سب سے بڑی بد نصیبی / کج روی یا بے بصیرتی یہی ہے کہ اس سب سے بنیادی حقیقت کی طرف وہ توجہ نہیں دیتا۔ غالباً اس حوالے سے آج تک سائنسی بنیادوں پر کوئی تحقیق نہیں کی گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نتائج ہمیشہ پیچ در پیچ کئی پیچیدہ، گنجلک اور تہہ در تہہ عوامل کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن جب انسان دیگر پیچیدہ مسائل حل کر سکتا ہے تو اس بین حقیقت کا حل کرنا بھی ناممکن نہیں بالخصوص ایک ایسی صورتِ حال میں جبکہ یہ ہماری روزمرہ زندگی کی سب سے بڑی اور بنیادی حقیقت ہے۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس حوالے سے ایک سائنسی انداز میں تحقیق کی جائے۔ اس حوالے سے یقیناً کئی سماجی عوامل ایک دوسرے کے ساتھ بالواسطہ یا بلاواسطہ گہرا تعلق رکھتے ہیں ان کے درمیان تعلق معلوم کر کے اس حوالے لے کئی حقائق سامنے لائے جاسکتے ہیں۔

اعمال صالحہ اور اعمال بد

چونکہ اس ساری بحث کا محور بنیادی طور پر اعمال صالحہ اور اعمال بد کے نفس پر اثرات ہیں لہذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ ان کی بالخصوص اعمال صالحہ کی کوئی واضح تعریف متعین کی جائے اور یہ بھی دیکھا جائے کہ از روئے قرآن کون کون سے افعال اعمال صالحہ میں اور کون سے افعال اعمال بد میں شمار کئے جاتے ہیں۔

اعمال صالح

ایمان کیساتھ ساتھ جس شرط کا پورے قرآن مجید میں مسلسل اعادہ کیا گیا ہے وہ اعمال صالح ہیں۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

(۲/۸۲)

وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالح کیے

صالح کا مادہ صلح ہے اس کے معنی ایسے کام کے ہیں جس سے کسی دوسرے کی خرابی، نقص یا کمی دور ہو جائے۔ ایسے کام جن سے توازن پیدا ہو اعمال صالح کہلاتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں جسمانی لحاظ سے صحیح اور تندرست بچے کے لیے صالحا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے (۷/۱۶۰)۔ قرآن کریم میں حسنات کے مقابلے میں سیئات کا لفظ اکثر آیا ہے اور (۲/۸۱-۸۲) میں سیئۃ کے مقابل میں عملوا الصالحات آیا ہے لہذا اعمال صالحہ اور حسنات ہم معنی ہیں۔ اس لئے دوسرے مقام پر من عمل صالحا کے مقابل میں من اساء آیا ہے (۳۱/۳۶)۔ لہذا اعمال صالحہ کے معنی ہیں ایسے کام جن سے انسان کی مضر صلاحیتیں

بیدار ہو جائیں اور اس طرح اس میں زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے نیز جن سے معاشرہ کا حسن و توازن قائم رہے اور ناہمواریاں دور ہو جائیں یہ فساد کی ضد ہے۔ قرآن مجید میں فساد اور صلاح کو ایک دوسرے کے مقابل استعمال کیا ہے (۲/۱۱)۔ اس کے علاوہ اسے لوگوں سے اچھے معاملات کرنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ (۲۸/۲۷)۔

ایمان اور اعمال صالح لازم و ملزوم ہیں۔ ایسے افعال ہی جو اللہ پر پختہ یقین کیساتھ انجام دیئے جائیں صرف وہی اعمال حتمی مثبت نتائج پیدا کر سکتے ہیں اگر دل سے اللہ پر یقین نہیں ہے تو اس طرح کے اعمال قطعی بے نتیجہ ثابت ہوتے ہیں۔ سورۃ الروم میں قرآن کریم نے من عمل صالحا کے مقابلے میں من کفر لا کر (۳۰/۲۲) اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اگر اعمال صالحہ ساتھ نہ ہوں تو ایمان، ایمان نہیں رہتا۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ صرف وہی اعمال، اعمال صالحہ متصور ہونگے جنہیں قرآن نے صالح قرار دیا ہے اس حوالے سے کوئی دیگر معیار قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید نے اگرچہ ان افعال کی کوئی فہرست نہیں دی لیکن قرآن مجید کے مطالعہ سے ان تمام افعال کو اس ضمن میں اعمال صالحہ شمار کیا جائے گا جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یا جن افعال پر اظہار پسندیدگی کیا گیا ہے۔ مثلاً:-

۱۔ انفاق:

انفاق سے مراد از انداز ضرورت تمام مال و دولت کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھنا ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۗ

(۲/۲۱۹)

یہ آپ سے پوچھتے ہیں اللہ کی راہ میں کیا دیں کہہ دیجئے جو ضرورت سے زائد ہو۔

یہ فعل بارگاہ رب العزت میں اتنا پسندیدہ ہے کہ اسے خود اللہ تعالیٰ نے خود کو قرض دینے کے مترادف قرار دیا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعَّهُ

(۲/۲۲۵)

لَهُ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۗ

کوئی ہے کہ اللہ کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا۔

صرف اس آیت سے ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس فعل کی کتنی اہمیت ہے لہذا اعمال صالح میں اسے نمایاں اہمیت حاصل ہے۔

۲۔ ادائیگی زکوٰۃ:

زکوٰۃ کی ادائیگی بھی ایک ایسا فعل ہے جس کی قرآن مجید میں نمایاں تاکید کی گئی ہے اسی وجہ سے جہاں جہاں ادائیگی صلوٰۃ کا حکم آیا ہے اسی کیساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم بھی ہے۔

وَاقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ

(۲/۱۱۰)

صلوٰۃ قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کیا کرو۔

زکوٰۃ سے مراد چونکہ وہ منجملہ محاصل ہیں جو ایک اسلامی حکومت اپنے اخراجات پورے کرنے کیلئے مسلمانوں پر عائد کرتی ہے اور ان کی عدم ادائیگی سے اسلامی حکومت بحران کا شکار ہو سکتی ہے لہذا متعدد مقامات پر اس کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے

میری کتاب "مروجہ اسلامی معاشی تصورات قرآنی تناظر میں"۔

۳۔ اقامتِ صلوٰۃ

قرآن مجید میں اقامتِ صلوٰۃ کا حکم متعدد مقامات پر دیا گیا ہے۔ الصلوٰۃ سے مراد جہاں ایک طرف نماز کی ادائیگی ہے تو دوسری طرف اس کے معنی قوانین خداوندی کے اتباع کے بھی ہیں۔ صلوٰۃ کے لغوی معنی کسی کے پیچھے متواتر اور مسلسل چلنے کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اتباعِ قوانین خداوندی کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان فرائض و ذمے داریوں کی کماحقہ ادائیگی جو از روئے قرآن مسلمانوں یا اہل ایمان پر عائد ہوتی ہیں۔

۴۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت

اللہ تعالیٰ کے مختلف احکامات جو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بیان کئے گئے ہیں ان کی مکمل اطاعت بھی اعمالِ صالحہ میں شامل ہے۔ اللہ کی اطاعت اور مکمل تابعداری کا حکم و التقوا اللہ (اللہ کا تقویٰ اختیار کرو) قرآن مجید میں کئی مقامات پر دیا گیا ہے مثلاً:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ

(۳/۱۰۲)

اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے۔

سیدھے سادے لفظوں میں اللہ کے احکامات کی کامل پاسداری تقویٰ ہے اور یہی اللہ کے نزدیک عزت کا معیار ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿۱۳﴾ (۲۹/۱۳)

اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے بے

شک اللہ جاننے والا اور باخبر ہے۔

۵۔ جہاد:

جہاد چونکہ اہل ایمان پر فرض ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مسلمانوں کو جہاد کیلئے حکم دیا گیا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ
تَكُونَ هُوَ شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا
شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

(۲/۲۱۶)

(مسلمانوں) تم پر (اللہ کی راہ میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے وہ تمہیں ناگوار تو ہوگا مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بُری لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لئے مضر ہو اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

لہذا اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاد کا شمار بھی اعمالِ صالحہ میں ہے۔

۶۔ احسان:

احسان سے مراد ہوتی ہے کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو درست کر دینا یا کسی کی کمی کو دور کر دینا۔ قرآن مجید نے اس اصطلاح کو صفاتِ عالیہ میں شمار کیا ہے۔

۷۔ شکر:

اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا اعلیٰ صفات میں شامل ہے اور اہل ایمان کی خصوصیات میں شامل ہے

۸۔ ماپ تول:

قرآن مجید میں ماپ تول کو صحیح رکھنے کی بہت تاکید کی ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وَالْبِيزَانِ بِالْقِسْطِ

(۶/۱۵۲)

اور ماپ تول انصاف کیساتھ پورا کرو۔

اس کے علاوہ دیگر متعدد مقامات پر بھی اس بابت حکم دیا گیا ہے۔

۹۔ صبر:

صبر کے بنیادی معنی استقامت، ثابت قدمی، استقلال اور جہد مسلسل کے ہیں۔ بالفاظ دیگر صابر سے مراد وہ اصحاب ہوں گے جو ہمت، استقلال، ثابت قدمی اور حوصلے سے مخالفت کا سامنا کریں، مایوس نہ ہوں، جی نہ ہاریں اور جلد بازی کا مظاہرہ نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے مومن مرد اور عورتوں کی ایک خصوصیت صابر ہونا بتائی ہے (۳۳/۳۵)۔

۱۰۔ رزق حلال کا حصول:

قرآن مجید میں رزق حلال کے حصول پر بہت زور دیا گیا ہے۔ رزق حلال کا حصول بھی اعمال صالحہ میں شامل ہے۔ یہاں رزق حلال سے مراد صرف اور صرف محنت سے حاصل ہونے والی آمدنی ہے قرآن کسی غیر مکتسب آمدنی کے تصور کو قبول نہیں کرتا جس میں کرایہ، مضاربہ اور مضارعت وغیرہ سے حاصل شدہ آمدنی شامل ہے۔ یہ سب باطل ذرائع آمدنی ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ”مروجہ اسلامی معاشی تصور قرآنی تناظر

میں“۔

۱۔ دیانت:

قرآن مجید میں امانت میں خیانت نہ کرنے کا واضح حکم دیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَ
تَخُونُوا أَمْنَكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○

(۲۴/۸)

اے اہل ایمان! نہ تو اللہ اور رسول کی امانت میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں
میں خیانت کرو اور تم (ان باتوں کو) جانتے ہو۔

متذکرہ بالا افعال کے علاوہ جن افعال کو اعمال صالح میں شمار کیا جاسکتا ہے ان میں عدل
صلہ رحمی، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت، وعدہ کا پورا کرنا، ادب، شفقت، اللہ کو کثرت
سے یاد کرنا، آیات اللہ پر تدبر کرنا، سچی گواہی دینا، بیہودہ افعال سے احتراز، کافروں
دوست بنانے سے مجتنب رہنا، حق کی راہ میں جدوجہد کرنا، اللہ کی متعین کردہ حدود کو
توڑنا، نماز میں عجز سے کام لینا، شرک اس کی شکل خواہ کچھ ہو اس سے بچنا، ناحق قتل نہ کرنا
بدکاری نہ کرنا، جاہلین سے کنارہ کشی کرنا، انصاف پر قائم رہنا، رفتار و گفتار میں میانہ روی
اخراجات میں اعتدال برتنا، حرص نفس سے محفوظ رہنا وغیرہ شامل ہیں۔

اعمال بد

جہاں تک برے افعال یا اعمال بد کا تعلق ہے وہ تمام افعال یا اعمال جو اعمال صالحہ کی
ہوں اس میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ایسے افعال کے لئے قرآن مجید ظلم کی اصطلاح استعمال
کرتا ہے۔

جہاں تک ظلم کا تعلق ہے اس کی جامع ترین تعریف خود قرآن مجید نے یہ کہہ کر دی ہے کہ
 "اللہ کی حدود سے تجاوز کرنے والے ظالم ہیں۔"

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۲۹﴾
 جو لوگ اللہ کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ ظالم ہیں۔

جہاں تک اللہ کی حدود کا تعلق ہے اس سے مراد وہ احکامات و قوانین ہیں جو اللہ نے اپنی
 مشیت سے طے کر دیئے ہیں اور ان کی بابت انسانوں کو قرآن مجید فرقان حمید کے ذریعے
 آگاہ کر دیا گیا ہے۔ ایسے تمام افعال جو احکام الہی کی خلاف ورزی میں شمار ہوں وہ ظلم کے
 زمرے میں آتے ہیں۔

ظالم کا لفظ قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے اور بالعموم قانون شکنی، حدود فراموشی،
 دوسروں کے اموال میں ناجائز تصرف، زیادتی، واجبات کی عدم ادائیگی اور اسی نوع کے
 دیگر منفی افعال کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ منجملہ تمام افعال ایسے ہیں جو نفسِ انسانی پر
 منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اس طرح ان افعال کے ذریعے ظالم خود اپنے نفس کے
 خسران کا سبب بنتا ہے۔

ظلم کے بنیادی معنی ہی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا، حد سے تجاوز کرنا، نقص
 اور کمی کرنے کے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی شے کو ایسی جگہ پر رکھنا جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے،
 چاہے یہ بگاڑ بلحاظ وقت ہو یا بلحاظ جگہ یہ بھی ظلم ہے۔ اس کے علاوہ اس کے معنی تاریکی کے
 بھی آتے ہیں یا روشنی کا معدوم ہو جانا یعنی ایسی جگہ کا روشن نہ ہونا جسے روشن ہونا چاہیے تھا۔
 اسی حوالے سے نور کے مقابل ظلمت کا لفظ قرآن مجید میں استعمال کیا گیا ہے (۲/۱۷)۔

سورۃ انبیاء میں ظلمات کا لفظ مصائب و مشکلات کے معنوں میں آیا ہے (۲۱/۸۷)۔

وہ افعال جنہیں قرآن مجید میں ظلم قرار دیا گیا ہے ان میں سے چند اہم افعال مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) پیسوں کا مال ناجائز طریقے سے کھانا (۲/۱۱۰)، وحی کو اختراع کہنا (۷/۳۷)

(۲) دوسروں کا مال باطل طریقوں سے کھانا (۲/۳۰)، غریبوں کا استحصال

(۳۸/۲۴)، اللہ تعالیٰ کے احکامات میں تحریف (۲/۵۹)، دنیاوی زندگی

کو منہا و مقصود جان لینا (۳/۱۱۶)، تن آسانی / آسائش کی ہوس (۱۱/۱۱۶)، وحی کی

مخالفت (۷/۳۷)، (۷/۱۰۳)، (۱۰/۱۷)، (۱۷/۲۷)، (۲۱/۳)، غیر اللہ کی حکومت

اختیار کرنا (۳۷/۲۲-۲۳)، اپنی بات اللہ سے منسوب کرنا (۷/۳۷)، (۶/۹۴)

(۶/۲۱)، (۳/۹۳)، (۱۱)، شرک سب سے بڑا ظلم ہے (۳۱/۱۳)، تکذیب احکام

خداوندی (۶/۱۵۸)، (۳۹/۳۲)، اللہ سے حاصل ہونے والا علم چھپانا (۲/۱۴۰)

(۱۴) اختلافات پیدا کرنا (۴۳/۶۵)، اللہ کی حدود سے تجاوز کرنا (۲/۲۲۹)،

قانون مکافات عمل سے انکار (۲/۲۵۴)، منافقت (۲۲/۴۹-۵۰)، احکام اللہ

کا استہزاء (۶/۶۸)، (۱۹)، جرم سے زیادہ سزا دینا (۶/۱۶۱)، دوسروں کو اللہ کی راہ

روکنا اور اسمیں کجی تلاش کرنا (۱۱/۱۸-۱۹)، کسی مربی سے خیانت (۱۴/۲۳)،

شہادت دینا (۵/۱۰۷)، شیطان کے پھیلانے ہوئے جال میں آجانا (۷/۲۳)

وغیرہ کو قرآن مجید میں ظلم قرار دیا گیا ہے۔ تاہم یہ بہر حال حتمی فہرست نہیں ہے قرآن پر

سے مزید ایسے کئی افعال سامنے آسکتے ہیں جنہیں قرآن نے ظلم قرار دیا ہے۔

اللہ کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتا

یہاں یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھی جانی لازمی ہے کہ اللہ کبھی، کسی بھی صورت میں انسانوں پر ظلم نہیں کرتا۔ اس حوالے سے متعدد آیات قرآنی کے حوالے دیئے جاسکتے ہیں جہاں قرآن مجید میں واضح اور دو ٹوک الفاظ میں اللہ کی یہ سنت بیان کی گئی ہے کہ وہ کبھی بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

(۴۰/۳۱)

وَمَا اللَّهُ بِرَبِّدٍ ظَلَمَ الْعِبَادَ

اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا

اللہ تو ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

بے شک اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔

(۴/۴۰)

اس کے علاوہ (۳/۱۰۷)، (۳/۱۸۲)، (۸/۵۱)، (۲۲/۱۰)، (۴۱/۴۶)، (۵۰/۲۹)، (۴۳/۷۶)، (۱۰/۴۴)، (۱۸/۴۹) کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں اس امر کا واضح گواہی اعلان موجود ہے کہ اللہ کسی پر، کبھی بھی، کسی بھی صورت میں، کسی بھی حوالے سے ظلم نہیں کرتا۔ یہ اس کی شان سے ماوراء ہے۔ اس کے برعکس یہ خود انسان ہے جو اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور خود اس ظلم کی وجہ سے تباہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ اس حقیقت کا بیان بھی قرآن میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے کہ انسان خود پر (اپنے نفس) ظلم کرتا ہے۔

أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ
 وَثَمُودَ ۗ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ الْمَدِينِ
 وَالْمُؤْتَفِكَةَ ۖ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ
 اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○ (۹/۷۰)

کیا ان کو ان لوگوں (کے حالات) کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے تھے (یعنی) نوح اور عاد اور ثمود کی قوم اور ابراہیم کی قوم اور مدین والے اور الٹی ہوئی بستیوں والے ان کے پاس رسول نشانیاں لیکر آئے اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔

اس بات کو ایک کلیئے کی شکل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ
 أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○ (۱۰/۴۴)

بے شک اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ ہی اپنے نفوس پر ظلم کرتے ہیں۔

ان آیات کے علاوہ (۱۶/۳۳)، (۲۹/۴۰)، (۳۰/۹)، (۲/۵۷)، (۷/۱۶۰)، (۱۶/۱۱۸) وغیرہ میں بھی اس حقیقت کا بین اظہار کیا گیا ہے کہ انسان خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ انسان اپنے نفس پر ظلم کیوں کرتا ہے اس پر تفصیلی بحث چوتھے باب میں کی گئی ہے۔

اعمال کے نتائج مستقبل میں مرتب ہوتے ہیں

اِذْ رَوَىٰ قُرْآنَ انْصَانِ اَعْمَالِ كَعْنَآجِ مَسْتَقْبَلِ مِثْمَرْتِ هَوْتِ هِي يَه اللّٰه كِي اِنْبِي مَشِيْتِ
 سے متعین کردہ ایک خاص تقدیر ہے جس کے تحت انسانی افعال کے نتائج مستقبل میں

بتدریج سامنے آنا شروع ہوتے ہیں اب یہ افعال کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے کہ ان کے نتائج کتنی دیر میں مرتب ہوتے ہیں بعض اوقات یہ نتائج فی الفور، بعض اوقات مستقبل قریب اور بسا اوقات مستقبل بعید میں اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ اس حوالے سے نیک اور بد اعمال میں کوئی امتیاز نہیں برتا گیا دونوں کے حوالے سے اصول ایک ہی ہے جہاں نیک اعمال کے لیے کہا گیا ہے کہ:

وَمَا تَقْدِرُوا إِلَّا أَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

(۲/۱۱۰)

جو بھلائی اپنے لئے آگے بھیج رکھو گے اس کو اللہ کے پاس پا لو گے بے شک اللہ تمہارے تمام اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔

وہیں اعمال بد کے لیے بھی یہی صورت حال ہے۔

تَرَى كَثِيرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ ۝

(۵/۸۰)

تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ کافروں سے دوستی رکھتے ہیں انہوں نے جو کچھ آگے بھیجا ہے وہ (بہت) برا ہے اللہ ان سے ناخوش ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔

اس لیے اہل ایمان کو بالخصوص ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس امر کو جانچتے رہیں کہ انہوں نے آگے کے لیے کیا بھیجا ہے؟

بَيَّاتُهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا
 قَدَّ مَتَّ لِعِذَابٍ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٩/١٨﴾

اے اہل ایمان اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر نفس کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے کل کے لیے
 کیا بھیجا ہے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو بے شک اللہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔

روزِ قیامت ہر نفس کو پورا پورا بدلہ ملے گا

تمام انسانی افعال کا مکمل اور جامع بدلہ روزِ قیامت ہر نفس کو مل جائے گا۔ یہ ایک ایسی بدیہی
 حقیقت ہے جس کا اعادہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔

فَكَيْفَ إِذَا جُمِعْتُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ تَوُفِّيَتْ
 كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٣/٢٥﴾

تو اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ان کو جمع کریں گے (یعنی) اس روز جس (کے
 آنے) میں کوئی شک نہیں (اس دن) ہر نفس اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا
 اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

سورۃ آل عمران میں ارشادِ باری ہے۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا
 وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا
 بَعِيدًا وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿٣/٣٠﴾

جس دن ہر شخص اپنے اعمال کی نیکی کو موجود پالے گا اور ان کی برائی کو بھی تو آرزو

کرے گا کہ اے کاش اس میں اور اس برائی میں دور کی مسافت ہو جاتی اور اللہ تم کو اپنے (غضب سے) ڈراتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔

اسی سورۃ میں آگے چل کر اس حقیقت کا اعادہ کیا گیا ہے۔

ثُمَّ تَوَفِّيْ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ

(۳/۱۶۱)

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

پھر ہر نفس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جس کا اعادہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر کیا گیا ہے

مثلاً: (۲/۲۸۱)، (۱۰/۳۰)، (۱۴/۵۱)، (۲۰/۱۵)، (۲۱/۴۷)، (۳۶/۵۳)،

(۳۹/۷۰)، (۴۰/۱۷)، (۸۱/۱۴)، (۸۲/۵)، (۸۲/۱۹)، (۸۹/۲۷) وغیرہ۔

باب ۴

نفسِ انسانی کو ضعف پہنچانے والے عوامل

گذشتہ ابواب میں اس امر پر بحث کی جا چکی ہے کہ تمام انسانی افعال کا اثر اس کے نفس پر ہوتا ہے خواہ وہ فعل مثبت ہو یا منفی، معمولی ہو یا بڑا۔ تاہم کچھ افعال ایسے ہیں جن کا قرآن مجید نے بالخصوص نفس کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ مثبت اور منفی دونوں حوالوں سے۔ اس باب میں بالخصوص ان افعال کو زیر بحث لایا جا رہا ہے جو نفسِ انسانی پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ تاہم ان افعال پر بحث سے قبل ایک امر کی صراحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام بنی نوع انسانی کو راہِ ہدایت دے دیتا اور کسی قسم کا کوئی مسئلہ ہی باقی نہ بچتا لیکن اس نے اپنی مشیت سے ایسا نہیں کیا تو کیوں نہیں کیا؟

اگر اللہ چاہتا تو تمام نفوس کو ہدایت دے دیتا

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے اسی نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا۔ وہ زندگی، موت اور شعور سمیت تمام تقدیرات پر مکمل قادر ہے۔

أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

(۱۰۶)

بے شک اللہ تعالیٰ تمام تقدیرات پر قادر ہے۔

اسی بنیاد پر اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہر نفس کو ہدایت دے دیتا اور تمام نفوس راہِ ہدایت پر رہتے اور کسی ایسے عامل یا عوامل کا وجود ہی نہ رہتا جو انسانی نفس کو ضرر پہنچاتے ہیں۔ اللہ نے اپنی مشیت سے ایسا نہیں کیا۔ اس حوالے سے ارشادِ ربانی ہے

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًى وَلَا كُنْ حَقِّ الْقَوْلِ
مِثِّي لَا مَلَكَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ○ (۳۲/۱۳)

اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو ہدایت دے دیتے لیکن میری طرف یہ بات قرار پا چکی
ہے کہ میں جہنم کو جن وانس سے بھر دوں گا۔

تاہم اس آیت سے ہرگز یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ نعوذ باللہ خدا ظالم ہے اور وہ خود ہی نہیں
چاہتا کہ تمام نفوس کو ہدایت ملے تاکہ جہنم کا پیٹ بھرا جاسکے۔ یہ تصور بھی گناہ ہے۔ اللہ سے
کسی قسم کے ظلم کا تصور وابستہ نہیں ہو سکتا۔ یہ اس کی شان سے بہت بعید ہے کہ وہ خود اپنی
پیدا کردہ مخلوقات جو اس کے آگے کسی قسم کی کوئی حیثیت نہیں رکھتیں جنہیں اگر وہ چاہے تو
چشم زدن میں نیست و نابود کر سکتا ہے ان پر ظلم کرتا پھرے۔ اس حوالے سے متعدد آیات
قرآنی کے حوالے پیچھے دیئے جا چکے ہیں اور از روئے قرآن یہ حقیقت واضح کی جا چکی ہے
کہ اللہ سے ظلم کا تصور وابستہ نہیں ہو سکتا۔ یہ انسان کے خود اپنے اعمال بد ہوتے ہیں جو
مکافاتِ عمل کی صورت میں جب مصائب و مشکلات کی صورت میں سامنے آتے ہیں تو
انسان سارا الزام آسانی سے اللہ پر دھردیتا ہے اور خود کو معصوم عن الخطاء قرار دے لیتا
ہے۔ اس کا ایک عام مظہر خود روزمرہ زندگی کی گفتگو ہے۔ غور کیجئے جب بھی کسی فعل کے کسی
منفی نتائج پر گفتگو کی جاتی ہے تو کیا کہا جاتا ہے ”اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو“ یعنی منفی نتائج نعوذ باللہ
اللہ صرف اللہ سے منسوب ہیں صرف اللہ ہی (معاذ اللہ) مصیبتیں اور پریشانیاں پیدا کرتا
ہے ورنہ حضرت انسان تو ”کمال خیر“ ہیں۔ اسی طرح ہر منفی بات سے پہلے ”خدا نخواستہ“ کا
استعمال کیا ظاہر کرتا ہے کہ اللہ ہی منفی صورتحال پیدا کرتا ہے۔ اس طرح کئی ام محاورے بھی

اس حوالے سے پیش کیے جاسکتے ہیں جسمیں مثبت پہلو انسان کی جانب اور منفی پہلو خدا سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ یاد رکھیے اس قسم کے جملے جن میں خدا کو منفی کردار میں پیش کیا گیا ہو اللہ کی شان میں گستاخی کے مترادف ہیں لہذا اس قسم کے جملوں، محاوروں اور گفتگو سے پرہیز لازمی ہے جس میں اللہ سے ایسی بات منسوب کی گئی ہو جو اس کی شان کے خلاف ہو۔ اس صورتحال کی ذمے داری بہت بڑی حد تک عقیدہ جبر پر عائد ہوتی ہے جسے عقائد کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ اس عقیدے کی اساس ہی یہ ہے کہ تمام مشکلات، پریشانیاں اور مصائب پہلے سے اللہ نے انسانوں کے نصیب میں لکھ دی ہیں۔ جب عقائد و تصورات کی بنیاد ہی یہ ہو کہ اللہ نے تمام منفی صورتحال پہلے سے لکھ دی ہے اور انسان اسے برداشت کرنے پر مجبور ہے تو زبان اور بیان میں اس قسم کے محاوروں، جملوں اور گفتگو کا در آنا ایک بالکل قدرتی امر ہے۔ تاہم یہ ساری صورتحال قطعی خلاف حقیقت ہے۔ قرآن اللہ کا ایک قطعی مختلف روپ پیش کرتا ہے جو اس سے قطعی متضاد ہے جو جمود کا رزق کھانے والے صدیوں سے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں اور پھر بھی اس بات پر مصر ہیں کہ

مستند ہے ان کا فرمایا ہوا

لہذا اس حقیقت کو ذہن میں رکھیے کہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا یہ انسان کے اپنے منفی اعمال ہیں جو اس کے سامنے منفی نتائج لے کر آتے ہیں۔

تمام نفوس کو ہدایت کیوں نہیں دی گئی؟

یہاں بدیہی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام نفوس کو آخر ہدایت کیوں نہیں دی گئی تاکہ دنیا سے شر کا خاتمہ ہو جاتا اور سب راہ ہدایت کے مسافر بن جاتے؟

اس کا جواب ہے آزمائش۔ آزمائش سے کیا مراد ہے اس پر پہلے باب میں بعنوان ”نفس انسانی ذریعہ آزمائش“ میں بحث کی جا چکی ہے اور باب سوم میں بھی بعنوان ”علت تخلیق ارض و سما“ میں بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہر نفس اپنے کسب کا بدلہ کمائے۔ اچھے افعال کے بدلے جنت اور افعالِ بد کا نتیجہ جہنم کی شکل میں سامنے آئے گا۔ اب اگر تمام نفوس کو راہِ ہدایت کا پابند کر دیا جاتا تو کائنات کی تخلیق کا مقصد ہی ختم ہو جاتا۔

تمام تکالیف نفس کی بدی کی وجہ آتی ہیں۔

مکافات عمل ایک ایسی حقیقت ہے جس کا مشاہدہ روزانہ زندگی میں عام طور پر ہوتا ہے اور غالباً سب سے زیادہ وقوع پذیر ہونے والی ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس سے انسان سب سے زیادہ نظریں چرائے رکھتا ہے۔ حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی یا جو آج بوو گے کل وہی کاٹنا ہوگا۔ جیسا کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ انسانی افعال کے نتائج مستقبل میں مرتب ہوتے ہیں۔ اچھے اعمال کے اچھے نتائج اور برے اعمال کے برے نتائج سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے سامنے جو بھی تکالیف آتی ہیں وہ صرف اور صرف اس کے نفس کی بدی کی وجہ سے آتی ہیں۔ انسان کا نفس اسے بدی یا برے افعال پر اکساتا ہے (اس اکساہٹ کی وجوہات پر پانچویں باب میں بحث کی گئی ہے) کمزور قوتِ ارادی کے حامل افراد اس اکساہٹ کے زیر اثر منفی افعال انجام دے دیتے ہیں اور پھر مکافات عمل کے قانون کے تحت ان افعال کے نتائج مختلف تکالیف، مصیبتوں اور پریشانیوں کی شکل میں سامنے آنے لگتے ہیں اس حقیقت کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ
مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنَ نَفْسِكَ

(۴/۷۹)

تم کو جو حسنات حاصل ہوتی ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں اور جو بھی برائی تم تک پہنچتی ہے وہ تمہارے نفس کی وجہ سے ہے۔

اس حقیقت کو بیان کرنے کا پیرایہ اظہار سورۃ آل عمران میں یہ ہے

أَوَلَمْ نَأْصِبْكُمْ مُمِصِبَةً قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَهَا
فَلْتُمْ أَنِي هَذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ إِنَّ
اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

(۳/۱۶۵)

اور کہا (یہ سچ نہیں کہ) جب (بھی) تمہیں کوئی ایسی تکلیف پہنچی جس سے دو گنی تم (خود) پہنچا چکے تھے تو تم نے کہہ دیا کہ یہ کہاں سے آگئی کہو کہ یہ تمہارے اپنے نفوس کی طرف سے ہے اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

نفس پر آنے والی مصیبت طے شدہ قانون کے مطابق آتی ہے:

اس امر کے ساتھ کہ انسان پر آنیوالی ہر قسم کی برائی اس کے اپنے نفس کی وجہ سے آتی ہے یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھنی لازمی ہے کہ دنیا اور نفوس پر آنے والی مصیبتیں اللہ کی اپنی مشیت سے طے کردہ قانون کے تحت آتی ہیں جنکا محرک صرف اور صرف انسان ہوتا ہے اللہ نے تو قانون متعین کر دیا ہے کہ ایسا کرو گے تو ایسا ہوگا ویسا کرو گے تو ویسا ہوگا۔ اب یہ انسان کا اپنا اختیار ہے کہ وہ کونسی تقدیر کا انتخاب کرتا ہے۔ اگر برائی کی راہ اختیار کی جائے گی تو برے افعال کے برے نتائج کی تقدیر اس پر منطبق ہو جائے گی اور جو اس جرم کی سزا ہوگی وہ اس تقدیر کے تحت متعین ہے مجرم کو اتنی ہی سزا ملے گی نہ اس سے زائد نہ کم۔ اس قانون کو ان

الفاظ میں سورۃ الحدید میں بیان کیا گیا ہے۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي
 أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ
 (۵۷/۲۲)

دنیا اور تمہارے نفوس میں آنیوالی تمام مصیبتیں ان کی تخلیق سے قبل متعین ہونے
 والے قانون کے تحت آتی ہیں یہ بات اللہ کے لیے بالکل آسان ہے۔

لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی شے کے تخلیق سے قبل اس کے افعال کے حوالے سے قانون
 مشیت طے ہو جاتا ہے اب یہ اس تخلیق کا انتخاب ہوتا ہے کہ وہ کس تقدیر کا انتخاب کرتی ہے
 جس قسم کی تقدیر کا انتخاب کیا جائے گا اسی طرح کے نتائج کا انتخاب کرنے والے کو سامنا
 کرنا ہوگا۔ یہ یاد رکھیے کہ اللہ کی سنت (قانون) کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔

لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا

اور اللہ کی سنت ہی تبدیل نہیں ہوتی۔
 (۳۳/۶۲)

وہ افعال جو نفس کو ضرر پہنچاتے ہیں:

از روئے قرآن ایسے افعال جن سے نفس کو ضرر پہنچتا ہے انہیں دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا
 ہے اول وہ افعال جن سے نفس کو نقصان پہنچتا ہے۔ دوم وہ انتہائی برے افعال جن سے نفس
 ہلاک ہو جاتا ہے۔ ایسے افعال جن سے نفس کو نقصان پہنچتا ہے ان میں شرک، کفر،
 منافقت، حیات بعد الموت سے انکار، تقلید، دنیا کی ہوس، بخل، اللہ کی حدود کو توڑنا یا اللہ کی
 نافرمانی وغیرہ شامل ہیں جبکہ ایسے افعال جو براہ راست نفس کی موت پر منتج ہوتے ہیں ان

میں باطل ذرائع سے رزق کا حصول، خود بھی قرآن سے دور رہنا اور لوگوں کو بھی اس سے روکنا اور جہاد سے فرار کے لیے حیلہ سازی شامل ہیں۔ ان افعال کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔ اس حوالے سے پہلے ان افعال کو زیر بحث لایا جا رہا ہے جو نفس کو نقصان پہنچاتے ہیں یعنی اس کے توازن کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ یہ افعال مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تقلید یا اسلاف پرستی:

تقلید یا اسلاف پرستی سے مراد یہ ہے کہ انسان عقل و فکر سے قطعی کوئی کام نہ لے اور جو کچھ اسلاف سے اس تک پہنچا ہے اسے حرفِ آخر مان کر اس پر بعینہ عمل کرتا رہے۔ بالکل اس جانور کی طرح جس کے ناک یا گلے میں رسی ڈال دی جاتی ہے اور وہ رسی کھینچنے والے کے پیچھے بغیر سوچے سمجھے چلتا چلا جائے۔ یہ غلامی کی سب سے بدترین شکل ہے۔ جسمانی غلامی اور اقتصادی غلامی سے بڑھ کر اس صورت میں انسان کی عقل و فکر ماؤف کر دی جاتی ہے اور انسان اور جانور میں قطعی کوئی فرق نہیں رہتا۔ یہ مذہبی پیشوائیت کا سب سے محبوب مشغلہ ہوتا ہے بلکہ مشغلہ سے بڑھ کر مجبوری ہوتی ہے کیونکہ ان کے روزگار کا انحصار اسی پر ہوتا ہے اور اپنے روزگار پر کوئی لات نہیں مارنا چاہتا۔ اب اس کی قیمت خود مذہبی پیشوائیت اور ان کے اطاعت گزار کیا ادا کرتے ہیں اس کی کسی کو کوئی فکر نہیں بلکہ یوں کہیے کہ شعور ہی نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افراد اور اقوام دونوں کو لہو کے بیل کی طرح سفر میں رہتے ہیں جو اپنی دانست میں نہ جانے کتنا فاصلہ طے کر چکا ہوتا ہے جبکہ درحقیقت وہ ایک دائرے میں سفر کر رہا ہوتا ہے۔ قرآن مجید سے محض ظن اور فاسد نفسانی خواہشات کی پیروی قرار دیتا ہے۔

إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَ آبَاؤُكُمْ مِمَّا
 أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا
 تَهْوَى الْأَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ رَبِّهِمْ الْهُدَى ۝ (۵۳/۲۳)

وہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑ لیے ہیں اللہ
 نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی یہ لوگ محض ظن اور (فاسد) خواہشات
 نفس کی پیروی کر رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کے طرف سے
 ہدایت آچکی ہے۔

اس آیت سے قطعی واضح ہے کہ اسلاف پرستی کو قرآن محض ظن اور فاسد خواہشات نفس کی
 پیروی قرار دیتا ہے۔ ظن کا لفظ شک اور قیاس کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن
 مجید میں اسے یقین اور حق کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ متذکرہ بالا
 آیت (۵۳/۲۳) سے بھی واضح ہے۔ قرآن مجید میں لفظ ظنون قیاس آرائیوں کے معنی
 میں بھی استعمال ہوا ہے (۱۰/۳۳) سورۃ بقرہ میں اسے علم کے مقابلے میں لایا گیا
 ہے (۲/۷۸)۔ سورۃ النساء میں بھی اسے علم کے مقابل لایا گیا ہے ”انہیں اس بابت علم
 نہیں وہ محض ظن کا اتباع کرتے ہیں“ (۲/۱۵۷) سورۃ یونس میں اسے حق کے مقابل لایا
 گیا ہے ”ظن حق کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا“ (۱۰/۳۶)۔ تصریحات بالا
 سے واضح ہے کہ قرآن مجید میں ظن کا لفظ قیاس آرائیوں، غیر یقینی صورتحال وغیرہ کے لیے
 استعمال ہوا ہے یعنی جہاں صورتحال واضح اور یقینی نہ ہو۔ ایسی صورتحال میں انسان کبھی اس
 کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی اس سے دور ہٹ جاتا ہے اس لحاظ سے دونوں پہلو ظن

کہلاتے ہیں۔

متذکرہ بالا آیات کی رو سے ان چند ناموں / باتوں کی پرستش جو اسلاف نے رکھ دیئے تھے محض ظن ہے جس کی کوئی سند اللہ نے نازل نہیں کی اس کے مقابل واضح طور پر صرف قرآن مجید کو ہدایت کہا گیا ہے اور اسلاف پرستی کو خواہشاتِ نفس کی پیروی قرار دیا گیا ہے۔ نفس اپنے منفی کردار میں صرف بری باتوں کا حکم دیتا ہے یہ انسان کے اعمال بد کو خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے جس سے انسان تباہی کے راستے پر چل پڑتا ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے پانچواں باب)۔ اس بنیاد پر اسلاف پرستی محض تباہی کا راستہ ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس سے سختی سے مجتنب رہنے کو کہا گیا ہے کیونکہ اس کا انجام محض تباہی ہی ہوتا ہے مثلاً:

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ
 أَتُجَادِلُونَنِي فِي أَسْمَاءِ سَيِّئَاتٍ مِّثْلُهَا أَنْتُمْ
 وَآبَاؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ
 فَانظُرُوا إِلَيَّ مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿٤١/٤١﴾

(ہود نے) کہا تمہارے رب کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب (کا نازل ہونا) مقرر ہو چکا ہے کیا تم مجھ سے ایسے ناموں کے بارے میں جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے (اپنی طرف سے) رکھ لیے ہیں جن کی خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی تو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

بنیادی طور پر اسلاف پرستی میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں انسان اللہ کے احکامات کی اطاعت کی بجائے، انسانوں کے احکامات کی اطاعت کرنے لگتا ہے اور بالائے ستم یہ کہ ان انسانوں کے احکامات کی جو مدتوں پہلے مرچکے ہوتے ہیں جنہوں

کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا ہوتا کہ آئیوالی نسلیں ڈھور ڈنگر کی طرح ان کے احکامات کی اطاعت کریں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ کے احکامات و ہدایات نظر انداز ہوتی ہیں تو نتیجہ سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ بد قسمتی سے لوگوں کی بڑی اکثریت اس بنیادی حقیقت سے آگہی نہیں رکھتی۔ اس حقیقت کو سورۃ الیوسف میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِنَا إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ
وَأَبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنْ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ
أَمْرًا أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ
أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝

(۱۲/۳۰)

جن چیزوں کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو وہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں اللہ نے ان کی کوئی سند نازل نہیں کی (یاد رکھو) اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں ہے اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر انسان علم نہیں رکھتے۔

اسلاف پرستی نری غفلت ہے اس مسلک میں چونکہ عقل و فکر، تدبر و دانش، استدلال جیسے الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کا استعمال چھوڑ دیتا ہے لہذا مشیت ایزدی کے طے شدہ قانون کے مطابق انہیں سوچنے سمجھنے سے معذور کر دیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے تقدیر کے قاضی کا روزِ ازل سے حکم یہ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ
تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ
غِشَاوَةً ۖ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

جو لوگ کافر ہیں (انہیں) تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لئے برابر ہے وہ ایمان

نہیں لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اس قسم کے لوگ کے لئے واپسی کی راہیں بھی مسدود کر دی جاتی ہیں۔

صُمُّ بِكُمْ عُنَىٰ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝

(۲/۱۸)

یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں کہ (کسی طرح راہ ہدایت کی طرف) لوٹ ہی نہیں سکتے۔

اس حقیقت کا اعادہ سورۃ یسین میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝

لِنُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنذِرَ آبَاؤَهُمْ فَهُمْ غٰفِلُونَ ۝

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰی أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

إِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ أَعْنَاقِهِمْ أَغْلًا فَبِتَّىٰ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُونَ ۝

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا

فَأَعْمَيْنَهُمْ فَهُمْ لَا يَبْصُرُونَ ۝

وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

(۳۶/۵-۱۰)

(یہ خدائے) غالب اور مہربان نے نازل کیا ہے تاکہ ان لوگوں کو جن کے باپ

دادا کو متنبہ نہیں کیا گیا تھا متنبہ کر دو کہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ان میں

سے اکثر پر (خدا کی) بات پوری ہو چکی ہے سو وہ ایمان نہیں لائیں گے ہم نے

ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں اور وہ ٹھوڑیوں تک ہیں۔

جن سے ان کے سر اوپر کوالٹ گئے ہیں ہم نے ایک آڑان کے سامنے کر دی ہے اور ایک آڑان ان کے پیچھے ہے جن سے ہم نے ان کو ڈھانک دیا ہے سو وہ دیکھ نہیں سکتے اور آپ ان کو نصیحت کریں نہ کریں ان کے لیے برابر ہے یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

بالفاظ دیگر وہ آنکھیں جو ماتھے پر ہیں وہ اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل جو سینوں میں ہوتے ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔

فَانْهَالَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ
الَّتِي فِي الصُّدُورِ

(۲۲/۴۶)

اصل بات یہ ہے کہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔

یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ اسلاف پرستی منہی خواہشات نفس میں سے ایک ہے (۵۳/۲۳) اور جب انسان خواہشات نفس کو اپنا معبود بنا لیتا ہے تو وہ علم رکھتے ہوئے گمراہ ہوتا ہے ایسی صورت میں اللہ بھی اس کے قلب (سوچنے سمجھنے کی صلاحیت) پر مہر لگا دیتا ہے بالفاظ دیگر اسے سلب کر لیتا ہے۔

اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ الْاِلٰهَ هَوٰٓىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰٓى عِلْمٍ وَّخَتَمَ
عَلٰٓى سَمْعِهٖ وَاَقْبَلَ وَاَجْعَلَ عَلٰٓى نَصْرِهٖ غِشْوَةً فَمَنْ يَهْدِيْهِ مِنْ
بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ

(۲۵/۲۳)

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود علم کے (گمراہ ہو رہا) ہے تو خدا نے (بھی) اس کو گمراہ کر دیا ان کے کانوں اور دلوں پر مہر لگا دی اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور اللہ کے سوا کون اسے راہ

راست پر لاسکتا ہے تو تم نصیحت کیوں نہیں پکڑتے؟

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ از روئے قرآن اسلاف پرستی نفس کی بری خواہشات میں سے ایک ہے اور اس راہ کو اختیار کرنا محض نفسانی خواہشات کی تکمیل ہے جس کی وجہ سے اللہ عقل و فہم کی صلاحیتیں سلب کر لیتا ہے اور انسان حیوانی سطح پر آجاتا ہے بلکہ اس سے بھی نیچے اور یہ راہ صرف اور صرف تباہی کی راہ ہے۔

أَذْلِكَ خَيْرٌ نُزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقْوَمِ ۝

إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِلظَّالِمِينَ ۝

إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ۝

طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيْطَانِ ۝

فَاتَّهَمُوا لَأَكْلُونِ مِنْهَا فَمَا لُتُونِ مِنْهَا الْبُطُونَ ۝

ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ ۝

ثُمَّ إِنَّ مَرَجِعُهُمْ إِلَى الْجَحِيمِ ۝

إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِّينَ ۝

فَهُمْ عَلَىٰ آثَرِهِمْ يُهْرَعُونَ ۝

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ الْأَوَّلِينَ ۝

(۳۷/۲۲-۷۱)

بھلا یہ مہمانی اچھی ہے یا تھوہر کا درخت ہم نے اس کو ظالموں کے لیے عذاب بنا رکھا ہے وہ ایک درخت ہے کہ جہنم کے اسفل میں آگے گا اس کے خوشے ایسے ہوں گے جیسے شیطانوں کے سروہ اسی میں سے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے پھر اس کے ساتھ ان کو گرم پانی ملا کر دیا جائے گا پھر ان کو دوزخ کی طرف لوٹایا

جائے گا انہوں نے باپ دادا کو گمراہی میں پایا سو وہ انہی کی طرف پیچھے دوڑے
چلے جاتے ہیں اور ان میں سے بیشتر پہلے لوگ بھی گمراہ ہو گئے تھے۔

ماحصل یہ کہ اسلاف پرستی یا آبا و اجداد کے نقش قدم پر اندھا دھند چلتے جانے کا انجام محض اور
محض جہنم کی آگ ہے۔

۲۔ دنیاوی زندگی کی ہوس

وہ محرک جس کی وجہ سے انسانوں کی اکثریت بلکہ بہت بڑی اکثریت اپنے نفس کو تباہی کے
گڑھے میں لا ڈالتی ہے وہ دنیاوی زندگی کی خواہشات کی تکمیل کی ہوس ہے۔

۳۔ بخل سے نفس کی تباہی

بخل کا مادہ بخل ہے اس کے معنی ہیں اپنی چیزوں کو ایسی صورتوں میں روک لینا جب
انہیں روکنا نہیں چاہیے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دینا اس میں شامل ہے۔ بالفاظ
دیگر اگر کوئی شخص کسی چیز کا مالک ہو اور دوسروں کو اس کی ضرورت محسوس ہو تو مالک ضرورت
کے وقت وہ شے ضرور تمندوں کو نہ دے نہ صرف یہ کہ خود ایسا کرے بلکہ دوسروں کو بھی ایسا
کرنے کی ترغیب دے، وہ جذبہ جو انسان کو اس طرز عمل پر اکساتا ہے وہ شیخ کہلاتا
ہے۔ متذکرہ بالا معنوں میں یہ لفظ قرآن مجید میں سورۃ النساء میں استعمال کیا گیا ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝

(۴۱/۳۷)

جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل سکھائیں اور جو مال اللہ نے اپنے فضل
سے ان کو عطا کیا ہے اسے چھپا چھپا کے رکھیں تو ایسے کافروں کے لیے ہم نے

ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

از روئے قرآن جو شخص بھی اس قسم کے طرز عمل کا مظاہرہ کرتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے جیسا کہ متذکرہ بالا آیت سے واضح ہے تاہم انسان کا یہ طرز عمل ان کے نفس کے لیے بھی شدید نقصان کا باعث بنتا ہے۔

هَآءِنتُمْ هَؤُلَاءِ تَدْعُونَ لِتُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ
اللَّهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْخُلُ ۚ وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا
يَبْخُلُ عَنْ نَفْسِهِ ۗ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ ۗ
وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبَدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۖ ثُمَّ لَا
يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۝

(۲۷/۳۸)

سنو تم وہ لوگ ہو جن کو اسلئے بلایا جاتا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور تم میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو بخل سے کام لیتے ہیں اور جو بھی بخل سے کام لے وہ اپنے نفس کے متعلق ہی بخل سے کام لیتا ہے ورنہ اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو اور اگر تم پھر جاؤ تو وہ تمہاری جگہ ایک اور قوم کو بدل کر لے آئے گا اور وہ تمہاری طرح نہیں ہوگی۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ اگر انسان بخل سے کام لیتا ہے تو وہ اپنے ہی نفس کو ضرر پہنچاتا ہے اور اس کے متعلق بخیلی سے کام لیتا ہے جیسا کہ آگے نفس کو تقویت دینے والے عناصر کی بحث میں ہم دیکھیں گے کہ از روئے قرآن انفاق (اللہ کی راہ میں رقم خرچ کرنا) سے نفس کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ بخل چونکہ انفاق کی ضد ہے لہذا یہ نفس کو ضعف پہنچانے کا سبب بن جاتا ہے اور نفس جس قدر ضعیف ہوگا انسان دنیاوی اور اخروی دونوں لی سے اتنا ہی خسارے میں چلا جائے گا۔ اس لحاظ سے بنیادی اصول یہ ہے

(۵۹/۹)

جو لوگ نفس کے بخل سے بچائے جاتے ہیں وہی فلاح پانے والے ہیں۔

لہذا بخل خواہ اس کی نوعیت کسی بھی قسم کی کیوں نہ ہو بہر حال نفس کے لیے ضرر رساں ہے کیونکہ یہ اس کی نشوونما اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

۴۔ استطاعت ہوتے ہوئے بھی ہجرت نہ کرنا نفس پر ظلم ہے

ایسے لوگ جو زمین پر کسی ایسے مقام پر ہوں جہاں وہ نامناسب حالات کا شکار ہوں جہاں اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنا مشکل ہو اور وہاں رہنا کفر اور اہل کفر کی حوصلہ افزائی کا باعث ہو اور وہ ہجرت کی استطاعت رکھتے ہوئے بھی ہجرت نہ کریں تو ان کا یہ عمل نفس پر ظلم ہے۔ تاہم ایسے لوگ جو بے بس ہوں ان کے لیے یہاں استثنیٰ ہے اور اللہ ایسے لوگوں کو معاف کرنے والا ہے تاہم الزام صرف ان لوگوں پر ہوگا جو ایسا کر سکتے ہوں اور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی ایسا نہ کریں۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَقَّعْتُمْ الْمَلَائِكَةَ ظَالِمِينَ أَلْفُسِهِمْ قَالُوا
فِيمَا كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ
قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا
قَالَ لَيْتَ بِنَاؤِكُمْ مَا وَبَّخْتُمْ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝

(۹۹-۴/۹۷)

جو لوگ اپنے نفوس پر ظلم کرتے ہیں جب فرشتے ان کو موت دینے لگتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں عاجز و ناتواں تھے

تھے فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔ ماسوا وہ مرد اور عورتیں اور بچے جو بے بس ہیں جو نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں اور نہ راہ جانتے ہیں۔ قریب ہے کہ اللہ ایسوں کو معاف کر دے اور اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

۵۔ اللہ کی حدود سے نکل جانا نفس کے لیے تباہی ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے انسانوں کے لیے کچھ حدود و قیود کا تعین کیا ہے جنہیں حدود اللہ کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا انسانوں سے ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ انسان اللہ کی متعین کردہ حدود و قیود میں رہیں اور ان سے باہر نہ نکلیں لیکن جو انسان ان حدود کو پامال کرتے ہیں وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے سوائے اس کے کہ اپنے نفوس کو خسارے میں ڈالتے ہیں۔ اس حقیقت کو سورۃ الیونس میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا
كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ، وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا
بِهَا جَاءَ تَهَارِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ
مَكَانٍ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ
الدِّينَ هَلِ مِنْ أُنْبِيَاءٍ مِّنْ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ

فَلَمَّا أَنْجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغَوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَعَيْتُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ مَتَاعَ الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۱۰/۲۲-۲۳)

وہی تو ہے وہ جو تم کو بر اور تر میں چلنے کی توفیق دیتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو اور کشتیاں عمدہ ہوا کے ذریعے سواروں کو لے کر چلنے لگتی ہیں اور وہ ان سے خوش ہوتے ہیں تو ناگہاں زناٹے کی ہوا چل پڑتی ہے اور لہریں ہر طرف سے ان پر جوش مارتی ہوئی آنے لگتی ہیں اور وہ خیال کرتے

ہیں کہ اب وہ لہروں میں گھر گئے تو اس وقت خالص اللہ کی عبادت کرتے اس سے دعا مانگتے ہیں کہ (اے اللہ) اگر تو ہم کو اس سے نجات دے دے تو ہم تیرے شکر گزار بندوں میں شامل ہو جائیں گے۔ پھر جب وہ انہیں نجات دے کر خشکی پر پہنچاتا ہے تو زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں لوگو! تمہارے حدود سے نکل جانے کا وبال تمہارے نفوس پر ہو گا تم دنیا کی زندگی سے منفعت حاصل کر لو پھر ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے اس وقت ہم تم کو بتائیں گے جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ایک خاص گروہ کے طرزِ عمل کی وضاحت کی ہے یہ گروہ وہ ہے جو زمین میں صرف فساد پھیلاتے ہیں تاہم کسی وقت اگر مصیبت میں پھنس جائیں تو بہت خشوع و خضوع کیساتھ اللہ کو یاد کرتے ہیں کہ اگر تو ہمیں اس مصیبت سے نجات دے گا تو ہم تیرے شکر گزار بندے بن جائیں گے اور جب وہ انہیں نجات دے دیتا ہے تو اپنی سابقہ حالت کو لوٹ جاتے ہیں اور فساد فی الارض میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ متذکرہ بالا آیت (۱۰/۲۳) میں ان کے طرزِ عمل کے لیے لفظ بغییم استعمال کیا گیا ہے اس کا مادہ ب غ ی ہے جس کی معنی ہیں میانہ روی سے آگے بڑھ جانے کی خواہش خواہ عملی طور پر ایسا کیا جاسکے نہ کیا جاسکے۔ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو طلب کرنا یا بگڑ جانا ہیں۔ قرآن مجید میں اسے متعدد مقامات پر انہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے مثلاً نبی علیہ (۲۲/۶۰) ”جس پر زیادتی ہوئی ہو“ فبغی علیہم (۲۸/۷۶) وہ (قارون) ان پر زیادتی کرتا تھا۔ ابتغار الفتنۃ (۳/۶) ”فتنہ پیدا کرنے کی انتہائی خواہش“، سورۃ مریم میں بغیہ کا لفظ حدود شکن کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ میں حرام قرار دی جانے والی اشیاء خورد و نوش کے بعد ان لوگوں کو اس سے استثناء دی گئی ہے جن کی بھوک سے جان پر بن

آئے تاہم ان کا اس حوالے سے حدود فراموشی کا ارادہ نہ ہو۔

فَمِنْ اضْطِرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۗ

(۲/۱۷۳)

پس جو لاچار ہو جائے مگر نہ سرکش کرنے والا ہو نہ حد سے بڑھنے والا۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ اللہ کی متعین کردہ حدود سے آگے جانا یا اللہ کی حدود کو توڑنا نفس کے لیے خسارے کا سودا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر احکام الہی کے بیان کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کی حدود ہیں ان سے باہر جانے کی کوشش نہ کرو۔ لہذا ان احکامات الہی کی خلاف ورزی کا مطلب اللہ کی حدود کو توڑنا ہے اور اس کا نتیجہ صرف اور صرف نفس کا خسارہ ہے۔

۶۔ نفس کی خیانت

نفس کی خیانت کی اصطلاح قرآن مجید میں دو مقامات (۳/۱۰۷)، (۲/۱۸۷) پر استعمال کی گئی ہے۔ خیانت کا مادہ خون ہے۔ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو کم کر دینے کے ہوتے ہیں۔ یہ امانت کی ضد ہے۔ اس کا اطلاق نفاق، بے وفائی، دین کے معاملے میں مخالفت کرنے کے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ذمہ داری نہ نبھانا اور عہد و پیمانہ کو توڑنے کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ کمزوری، اعتماد و بھروسہ کو ضائع کرنا بھی اس کے معنوں میں شامل ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید میں ارشادِ باری ہے۔

أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ
هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ

أَنْكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا
عَنْكُمْ فَالْتَمِنُوا بِبَشَرٍ نَبَأْتُ لَكُمْ لَكُمْ - (۲/۱۸۷)

روزوں کی راتوں میں تمہارے لیے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا ہے وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنے نفوس میں خیانت (حق تلفی) کرتے تھے اس لیے اس نے تم پر مہربانی کی اور تمہاری اصلاح کر دی سواب تم ان کے پاس جاؤ اور اللہ کے قانون کے مطابق (اولاد) کی جستجو کرو۔

رمضان کی راتوں میں جنسی اختلاط سے بالکل تیار رہنا ایک مخصوص تناظر میں جنس کے فطری حق کی ذمہ داری نہ نبھانا ہے گو یہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس آیت کریمہ میں نفس میں خیانت سے مراد فطری جذبات کے حوالے سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو نہ نبھانا ہے جس کی اس آیت کے ذریعے ممانعت کر دی گئی ہے اور مسلمانوں کو رمضان کی راتوں میں اپنی بیویوں سے جنسی اختلاط کی اجازت دے کر نفس کی خیانت کی اس راہ کو بند کر دیا گیا ہے۔ یقیناً اللہ اپنے نفوس میں خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس حقیقت کا اظہار سورۃ النساء کی مندرجہ ذیل آیت سے ہوتا ہے۔

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الدِّينِ يُخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ ۗ إِنَّ
اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَانًا أَثِيمًا ۝ (۴/۱۰۷)

اور ان لوگوں کی طرف سے جو اپنے نفوس کی خیانت کرتے ہیں مت جھگڑیے اللہ خائن اور گناہ گاروں کو دوست نہیں رکھتا۔

نفس کی خیانت کرنے والے یہ لوگ کون ہیں اس کی صراحت اس آیت سے متصل اگلی آیت میں یہ کہہ کر دی گئی کہ یہ منافقین ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تو اطاعت و فرماں برداری کا اقرار کرتے اور راتوں کو تنہائی میں آپ کے خلاف مشورے / سازشیں کرتے۔

يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ
مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَى مِنَ الْقَوْلِ
وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا

(۴/۱۰۸)

وہ لوگوں کے سامنے تو چھپ جاتے ہیں (لیکن) اللہ سے نہیں چھپ سکتے وہ راتوں کے وقت ناپسندیدہ باتوں کے خفیہ مشورے کرتے ہیں اس وقت بھی اللہ ان کے پاس ہوتا ہے اللہ ان کے تمام اعمال کو گھیرے ہوئے ہے۔

لہذا ان آیات کریمہ (۴/۱۰۷-۱۰۸) سے جو بالواسطہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ منافقت نفس کی خیانت ہے۔ منافق بنیادی طور پر دورخی پالیسی پر چلتا ہے وہ بظاہر مسلمانوں کے گروہ میں ہوتا ہے ان کو اپنی حمایت کا یقین دلاتا ہے لیکن در پردہ وہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف ہوتا ہے۔ اپنے اس طرز عمل سے وہ دین سے بے وفائی کرتا ہے، اس کی مخالفت کرتا ہے اور اپنے اوپر مسلمانوں کے اعتماد کو مجروح کرتا ہے اس حوالے سے اپنے نفس کی خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ طرز عمل ظاہر ہے صرف اور صرف تباہی کی راہ پر لے جاسکتا ہے اس سے ماسوا کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ (۴/۱۰۸) میں ایسے لوگوں کو خود اللہ تعالیٰ نے خائن اور اشیم (گناہ گار) قرار دیا ہے اور ان سے اپنی بے زاری کا اعلان کیا ہے۔

نفس کی ہلاکت

اس سے قبل کہ نفس کی ہلاکت پر بحث کی جائے لفظ ”ہلاک“ کے معنی کا تعین ضروری ہے۔ اس لفظ کا مادہ ھلک ہے جس کے بنیادی معنی ٹوٹنے، گر پڑنے، مرجانے کے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لفظ عذاب، فقر اور خوف کے معنی بھی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی چیز کا اپنے پاس نہ رہنا، کسی شے کا خراب اور بد حال ہو جانا یا ضائع ہو جانا یا ایسی اشیاء کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو بالآخر تباہی کے طرف لے جائیں۔ ان سب مفہام میں کے لیے ہلاک کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہلاکت کے معنی قوت کے کم ہو جانے کے بھی ہیں۔ سورۃ الحاقۃ میں اسے اقتدار چھن جانے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ ہلک عنی سلطانہ (۶۹/۲۹) ”میرا اقتدار مجھ سے چھن گیا“۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ ہلاک ہونے کے معنی صرف مرجانا نہیں بلکہ یہ ضعیف، ٹوٹنے، ضائع ہونے یا ایسے امور کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جن کا انجام محض تباہی ہو۔ اس پس منظر میں نفس کی ہلاکت سے مراد نفس کی موت کے علاوہ اس کا ضعف، ضائع ہو جانا یا قوت کے کم ہو جانے کے ہوں گے۔ قرآن مجید میں یہ اصطلاح دو (۲) حوالوں سے استعمال ہوئی ہے اول تین مخصوص اعمال بد کے نتیجے میں نفس کی ہلاکت کے حوالے سے، دوم شرک اور دوسرے گناہوں کے نتیجے میں نفس کے مصنوعی تکبر کے خاتمے کے لئے۔ ان دونوں حوالوں سے اس کی وضاحت مندرجہ ذیل ہے:

(۱) وہ افعال یہ جو نفس کی ہلاکت پر منتج ہوتے ہیں

از روئے قرآن تین (۳) مخصوص افعال بد ایسے ہیں جو نفس کی مکمل تباہی کا پیش خیمہ ثابت

ہوتے ہیں۔ ان افعال میں دوسروں کا مال باطل ذرائع سے کھانا، قرآن سے دور رہنا اور دوسروں کو بھی قرآن سے روکنا اور جہاد سے فرار کے لئے حیلہ سازی شامل ہیں۔ ان تینوں افعال بد کی وضاحت ذیل میں کی گئی ہے:

الف) دوسروں کا مال باطل طریقوں سے کھانے سے نفس کی ہلاکت

ازروئے قرآن دوسروں کا مال باطل طریقوں سے کھانے سے نفس کی ہلاکت واقع ہو جاتی ہے۔ اس امر کا اثبات حسب ذیل آیت قرآنی سے ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ

بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ

(۴/۲۹)

وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا

اے اہل ایمان! ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ ہاں مگر آپس کی رضامندی سے تجارت کے ذریعے مال کا حصول جائز ہے اور تم اپنے نفوس کو قتل

نہ کرو اللہ یقیناً تم پر بار بار رحم کرنے والا ہے۔

یہاں باطل طریقوں سے مراد حصول مال کے وہ تمام طریقے ہیں جنہیں قرآن نے ناجائز قرار دیا ہو اور عام اصول و ضوابط کے تحت بھی جائز ہونے کی سند نہ رکھتے ہوں۔ جہاں تک حصول مال یا رزق کے حصول کے ذریعے کا تعلق ہے جو قرآن میں مذکور ہے تو وہ صرف اور صرف محنت کا ہے اس سے ماسوا کچھ نہیں۔ اس بنیاد پر کرایہ، مضاربہ، مزارعت اور ایسے تمام ذرائع جو ماسوا انسانی محنت آمدنی پیدا کرتے ہوں ازروئے قرآن جائز نہیں ہیں۔ لہذا ازروئے قرآن حلال ذریعہ رزق صرف انسانی محنت ہے اس کے ماسوا سب باطل ہے اس حوالے سے تفصیلی بحث مری کتاب ”مروجہ اسلامی معاشی تصویرت قرآنی تناظر

میں“ میں کی گئی ہے۔ لہذا ہر وہ مال یا رزق جو انسانی محنت کا نتیجہ نہ ہو وہ از روئے قرآن باطل ہے۔ دوسری طرف مال کے حصول کا کوئی بھی ایسا طریقہ جو عام قانون معاہدہ کی خلاف ورزی کے ذیل میں آتا ہو وہ بھی ظاہر ہے باطل ذرائع رزق میں ہی شمار ہوگا۔ اس کی مثالوں میں دھوکہ، غلط بیانی، ناجائز دباؤ، معاہدہ کی شرائط کی عدم پاسداری، نابالغ سے معاہدہ وغیرہ شامل ہیں۔ بالفاظ دیگر کوئی بھی ایسا مال جو قانون معاہدہ کی خلاف ورزی سے حاصل کیا گیا ہو وہ بھی باطل ذرائع میں شمار کیا جائے گا۔ از روئے قرآن اس قسم کے ذرائع سے حاصل کیا جانے والا مال یا زرف نفس کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔

(ب) قرآن سے دور رہنا اور دوسروں کو بھی قرآن سے روکنا نفس کی ہلاکت ہے از روئے قرآن، قرآن سے دور رہنا اور لوگوں کو قرآن کے قریب آنے سے روکنا ایسے افعال ہیں جو نفس کی ہلاکت پر منتج ہوتے ہیں۔

وَهُمْ يَبْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْتَوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِنْ يُصْلِحْ كُونُ
إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ

(۶/۳۶)

وہ اس (قرآن) سے (اوروں کو بھی) روکتے ہیں اور خود بھی دور رہتے ہیں (ان باتوں سے) وہ اپنے نفس ہی کو ہلاک کرتے ہیں اور اس کا شعور بھی نہیں رکھتے۔

ایسے لوگ جو خود بھی اپنی بد نصیبی کی وجہ سے قرآن سے دور رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس راہ ہدایت سے روکنے کی شعوری یا لاشعوری کوشش میں مصروف ہوتے ہیں وہ بھی اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت صرف قرآن ہے صرف قرآنی تعلیمات سے ہی نفس کی ترقی، اس توازن اور استحکام ممکن ہے۔ انسانی عقل میں یہ

صلاحیت و ولایت ہی نہیں کی گئی کہ وہ فلاح کی راہ کا تعین تو درکنار اسے دریافت بھی کر سکے۔ لہذا جو لوگ اس منبع ہدایت سے دور رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے ہیں وہ ایک ایسی راہ کے مسافر ہوتے ہیں جو صرف اور صرف تباہی کی راہ ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اس امر کا شعور نہیں رکھتے کہ وہ کر کیا رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر اپنے لیے کس تباہی کا سامان کر رہے ہیں۔

(ج) جہاد سے فرار کے لیے حیلہ سازی نفس کی موت ہے

جہاد خواہ وہ مال کے ذریعے ہو یا جان کے ذریعے اس پر قرآن مجید میں بہت زور دیا گیا ہے۔

انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ
وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ
إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○

(۹/۳۱)

اور اللہ کی راہ میں نکلو خواہ ہلکے ہو یا بھاری اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کرو یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو تو۔

صرف متذکرہ بالا آیت ہی نہیں جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے اس کے علاوہ بھی قرآن مجید کی متعدد آیات پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً (۹/۳۱)، (۹/۳۹) وغیرہ جہاں جہاد کا حکم اور ترغیب موجود ہے۔ جہاد مسلمانوں پر فرض ہے تاہم ایسے لوگ جو اس عظیم مقصد سے راہ فر اختیار کریں اور اس مقصد کے لیے حیلے بہانے تلاش کریں وہ بھی اپنے نفوس کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَآتَبَعُوكَ
وَلَكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ
لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ
وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝

(۹/۴۲)

اگر مال غنیمت سہل الحصول ہوتا اور سفر بھی ہلکا ہوتا تو تمہارے ساتھ چل دیتے
لیکن مسافت ان کو دور کی نظر آئی تو خدا کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم طاقت
رکھتے تو آپ کیساتھ ضرور نکل پڑتے یہ اپنے نفوس کو ہلاک کر رہے ہیں اور اللہ
جانتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔

فوری معاوضے کے طالب ایسے لوگ جن کی نظریں صرف اور صرف جلد ہاتھ آنے والے
مفادات پر جمی ہوتی ہیں جب ان کے سامنے کوئی ایسی صورتحال آتی ہے جو مشکل اور طویل
المیعاد ہوتی ہے تو فوراً حیلہ سازی شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم لوگ بھی اپنے طرز عمل سے
اپنے ہی نفوس کو ہلاک کرتے ہیں اور کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے۔

ہلاکت نفس کی اصطلاح، اصلاح کے معنوں میں:

قرآن مجید میں دو مقامات ایسے ہیں جہاں نفس کی ہلاکت کی اصطلاح، اصلاحی معنوں میں
استعمال کی گئی ہے۔ اس حوالے سے سورۃ البقرہ میں ارشاد خداوندی ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ أَنْتُمْ مَنَافِقُونَ
يَأْتِنَاذِكُمْ الْعَجَل فَتُوبُوا إِلَى بَارِيكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ
ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِيكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ
هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

(۲/۵۴)

جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! پچھڑے کو معبود بنا کر تم نے اپنے نفوس پر ظلم کیا ہے اب تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو اور اپنے نفوس (امارہ) کو قتل کرو تمہاری بہتری اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسی میں ہے تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں اس تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں ان کی قوم نے پچھڑے کی عبادت شروع کر دی تھی جو پستی کی انتہائی حد تھی۔ شرک ویسے بھی سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس گناہ کے نتیجے میں ان کی قوم نے اپنے نفوس پر بڑا ظلم کیا تھا یہی وجہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو اس صورتحال میں ان ملول ہونا ایک فطری امر تھا۔ تاہم اس صورتحال کی اصلاح کے لیے اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے ان کی قوم کو جو طریقہ کار بتایا وہ یہ تھا کہ اس گناہ کی وجہ سے ان کا نفس امارہ جس طریقے سے ان پر حاوی ہو گیا ہے اس سے نجات کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اپنے نفس امارہ کو جھکا دو یا اسے اپنے قابو میں دوبارہ لے آؤ اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے اس فعل پر اللہ سے استغفار کرو بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا اور بے پناہ رحم کرنے والا ہے۔ نتیجے کے طور پر ان کی قوم نے اللہ سے توبہ کی اور اللہ نے ان کی اس توبہ کو قبول کیا۔

اس آیت سے جو بنیادی نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب نفس کی سرکشی اس حد تک بڑھ جائے کہ نفس امارہ خود انسان پر حاوی ہو جائے تو اس سے نجات کا واحد راستہ سچے دل سے توبہ اور ضبط نفس اس حوالے سے ہے کہ انسان ان تمام افعال بد سے تائب ہو جائے جن کی وجہ سے وہ نفس امارہ کے ہاتھوں کھلونہ بن جاتا ہے اور صدق دل سے راہ راست پر چلنے

عہد کرے تو نفس امارہ خود بخود ”ہلاک“ ہو جاتا ہے اور انسان بتدریج نفس مطمئنہ کی سطح تک پہنچ سکتا ہے۔

اس حوالے سے جہاں تک روایتی فکر کا تعلق ہے اس حوالے سے جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ عقل و فہم سے قطعی ماورا ہے۔ روایتی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اس شرک سے روکا تو انہیں توبہ کا احساس ہوا اور توبہ کا طریقہ باہمی قتل و غارت گری تجویز کیا گیا۔ **فَاَقْتُلُواْ اَنْفُسَكُمْ** (اپنے کو آپس میں قتل کرو) کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ سب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ دوسری یہ کہ ارتکابِ شرک کرنے والوں کو کھڑا کر دیا گیا اور جو اس سے محفوظ رہے تھے انہیں قتل کرنے کا حکم دیا گیا چنانچہ انہوں نے قتل عام کیا۔ مقتولین کی تعداد ستر ہزار بیان کی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ صورتحال بلا تبصرہ ہے۔ اقبال نے سچ کہا تھا:

حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ امت روایات میں کھو گئی

اس حوالے سے دوسری آیت سورۃ النساء کی آیت ۶۶ ہے جہاں ارشادِ بانی ہے۔

وَلَوْ اَنَّآ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنْ اَقْتُلُوْاْ اَنْفُسَكُمْ وَاَخْرَجُوْا
مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوْهُۥ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ وَاَنْتُمْ
فَعَلُوْا مَا يُوعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهٖمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝۶۶

(۴/۶۶)

اگر ہم ان پر فرض کر دیتے کہ اپنے نفوس (امارہ) کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو اسے ان میں سے بہت ہی کم لوگ یہ حکم بجالاتے اور اگر یہ وہی کریں جن کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو یقیناً یہی ان کے لیے بہتر اور پختگی کا موجب ہے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ یہ خطاب کن لوگوں سے کیا جا رہا ہے تو اس کا جواب ہے منافقین سے اور ان لوگوں سے جنہوں نے اپنے نفوس پر ظلم کیا تھا۔ اس آیت (۴/۶۶) سے بالکل متصل گذشتہ چھ (۶) آیات کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں مسلسل ان لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے جن کا طرز عمل منافقانہ ہے۔ ان کے طرز عمل کے بیان کے بعد کہا گیا ہے کہ اگر انہیں یہ حکم دیا جاتا کہ اپنے نفس (امارہ) کو اپنے قابو میں لاؤ یا اسے زیر کر دو تو ان منافقین اور نفس کو خسارے میں ڈالنے والوں میں سے محدودے چند ہی ایسے ہوتے جو اس حکم ربانی کی تعمیل کر پاتے۔ یہاں اگر نفس کے قتل سے مراد انسانی قتل کیا جائے تو ظاہر ہے اس قسم کا حکم اللہ کیسے دے سکتا ہے کہ خود اپنے آپ کو قتل کر ڈالو؟ یہ یقیناً بعید از عقل و فہم بات ہے۔ یہاں بھی اور گذشتہ آیت میں بھی قتل نفس سے مراد نفس (امارہ) کا قتل ہے۔ یعنی منفی حیوانی اور شیطانی خواہشات پر قابو پانا تا کہ انسان حیوانی سطح سے اٹھ سکے اور انسانی سطح پر آسکے۔ اس امر کی مزید تصدیق خود آیت کے آخری الفاظ سے ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ "اگر یہ وہی کریں جس کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو یقیناً ان کے لیے بہتری اور پختگی کا سبب ہوتا"۔ قرآن کس بات کی نصیحت کر رہا ہے یقیناً تقویٰ کی راہ پر چلنے کی یہی وہ واحد راہ ہے جس پر چل کر انسانی نفس پختگی حاصل کرتا ہے۔

اس کی تصدیق خود اس آیت میں استعمال کیا جانے والا لفظ "تثبیتا" کر رہا ہے۔ اس کا مادہ ث ب ت ہے اور جس کے بنیادی معنی دوام شے کے ہوتے ہیں۔ سورۃ رعد میں اثبات بمقابلہ محو (مٹا دینا) آیا ہے (۱۳/۳۹)۔ سورۃ ابراہیم میں اسے رائیگاں نہ جانے، نتیجہ خیز اور بار آور ہونے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے (۱۲/۲۷)۔ سورۃ النحل میں اسے لغزش نہ کرنے یا جھے رہنے کے معنی میں (۱۶/۹۴)، سورۃ بنی اسرائیل میں نہ جھکنے، قطعی مائل

ہونے (۸/۱۱) کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

یہ صورت حال اس امر پر بین شاہد ہے کہ اللہ کی نصیحت (تقویٰ کی راہ) پر چلنے سے نفس انسانی کو تقویت / پختگی حاصل ہوتی ہے اور وہ چٹان کی مانند ٹھوس ہو جاتا ہے جس سے منفی خواہشات، میلانات اور شیطانی ہتھکنڈے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ تو سکتے ہیں اس کا بگاڑ کچھ نہیں سکتے۔

آنحضرت ﷺ کے خصوصی حوالے سے

نفس کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا ذکر مبارک قرآن مجید میں تین (۳) مختلف مقامات پر آیا ہے اگرچہ تینوں جگہ مضمون ایک ہی ہے۔ ان تینوں مقامات پر آپ ﷺ کے اس خلوص، ہمدردی اور انسانیت کے لئے فلاح کے جذبے کا اظہار کیا گیا جو نبی اکرم ﷺ اپنے دل میں رکھتے تھے۔ اس حوالے سے ارشادِ باری ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا

(۱۸/۶)

بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسْفًا ۝

اے پیغمبر اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپ اپنے آپ کو رنج سے ہلاک کر لیں گے

اندازہ کیجیے نبی کے دل میں اپنے بدترین مخالفین کے لئے اتنا درد ہے کہ خود قرآن شہادت دے رہا ہے کہ کیا آپ ﷺ اس غم میں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے آپ ﷺ اپنے آپ کو رنج و غم سے ہلاک کر لیں گے تصور کیجئے جس نبی کے دل میں اپنے بدترین دشمنوں کے لئے اتنا درد ہے تو اپنی امت کے لئے اس کے خلوص کی انتہا کیا ہوگی؟

یہ مضمون (۲۶/۳) اور (۳۵/۸) میں بھی مکرر آیا ہے۔

باب ۵

شیطان اور نفسِ امارہ کا باہمی تعلق

از روئے قرآن انسان جب اپنے اعمال بد سے اس مرحلے تک پہنچ جائے کہ اللہ کی رحمت اس سے منہ موڑ لے تو اس مرحلے پر انسان نفسِ امارہ کا غلام ہو جاتا ہے اور اس صورتِ حال میں نفسِ امارہ انسان کو سوائے بربادی کی راہ دکھانے کے اور کچھ نہیں کرتا۔ اس پر سونے پر سہاگہ شیطان کا کردار ہوتا ہے جو اس راہ کو مزید خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے اور انسان ان دونوں کی ملی بھگت سے مکمل تباہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

اس حوالے سے بحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول شیطان کی نوعیت و ماہیت اور اس کی بنی نوع انسانی سے دشمنی کی وجوہات دوم وہ شیطانی ہتھکنڈے جن سے وہ انسانوں کو بھڑکاتا ہے اور سوم اس حوالے سے نفسِ امارہ کا کردار۔ ان تینوں نکات پر بحث مندرجہ ذیل ہے۔

شیطان اور اس کی نوعیت و ماہیت اور نوع انسانی سے اس کی دشمنی کی وجوہات:

از روئے قرآن شیطان پوری ایک نوع یعنی نوع جنات کا نمائندہ ہے

وَاذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا

(۱۸/۵۰)

إِلَّا ابْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا ماسوا ابلیس

کے وہ جنات میں سے تھا۔

جنات ایک آتش مخلوق ہے

(۵۵/۱۵)

وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝

اور جنات کو ایک آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔

اس نوع کی تخلیق انسانوں سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔

(۱۵/۲۷)

وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُومِ ۝

اور جنات کو اس سے قبل (انسانوں سے پہلے) بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔

بحیثیت نوع ان میں تولید و تناسل کا سلسلہ جاری ہے

(۱۸/۵۰)

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا
إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ
رَبِّهِ إِذْ أَفْتَنَهُ وَنَسَىٰ وَذَرَيْتَنَّهُ أَزْوَاجًا مِّنْ دُونِي
وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا ۝

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس
کے وہ جنات میں سے تھا تو اپنے رب کے حکم سے باہر ہو گیا کیا تم اس کی اور اس
کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں اور ظالموں
کے لئے برا بدل ہے۔

اس آیت سے واضح ہے کہ نوع جنات میں بھی انسانوں کی طرح تولید و تناسل کا سلسلہ
جاری ہے اور یہ بہت کثیر تعداد میں ہیں۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنْ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ
عَلَيْهِمْ بِجَبَلِكَ وَارْحِلْكَ وَنَشَارِكُهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ
وَعِدَّهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ الْأَغْوَارَ (۱۷/۶۴)

اوران میں سے جس کو بہکا سکے اپنی آواز سے بہکا تارہ اوران پر اپنے سواروں
اور پیادوں کو چڑھا کر لاتا تارہ اوران کے مال و اولاد میں شریک ہوتا تارہ اوران
سے وعدے کرتا تارہ اور شیطان جو وعدے ان سے کرتا ہے وہ سب دھوکا ہیں۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ اللہ کی جانب سے شیطان کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ
اپنے تمام ہتھکنڈے، اپنے تمام لاؤ لشکر نوع انسانی کو بہکانے کے لئے استعمال کر سکتا ہے
اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نوع خاصی کثیر تعداد میں موجود ہے۔ اس نوع کی نوعی ساخت
اس قسم کی ہے کہ وہ انسان کو دیکھ سکتے ہیں لیکن انسان انہیں نہیں دیکھ سکتے۔

إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ
إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ (۷/۲۷)

وہ اور اس کا قبیلہ تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے رہتے ہیں جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھ
سکتے ہم نے شیطانوں کو انہی لوگوں کا رفیق بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے ہیں۔

جب انسان مختلف ارتقائی مراحل سے گذر کر زمین پر ایک باشعور نوع کی حیثیت سے
سامنے آیا تو اللہ تعالیٰ نے جملہ کائناتی قوتوں (ملائکہ) کو انسان کی اطاعت کا حکم دیا تو اس
نوع نے انکار کر دیا (۱۸/۵۰) اس کی بنیادی وجہ خود اس نوع کے نمائندے شیطان
نزدیک انسان کو جنات پر فضیلت دینے کا مشیت ایزدی کا فیصلہ تھا۔

قَالَ أَرَأَيْتَكَ هَذَا الَّذِي كَرَّمْتَنَا عَلَىٰ لِبْنِ آخَرِينَ
إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا

(۱۷/۶۲)

کہنے لگا اچھا دیکھ لے اسے تو نے مجھ پر فضیلت تو دی ہے اگر تو مجھ کو قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں تھوڑے سے افراد کے سوا اس کی (تمام) اولاد کی جڑ کاٹتا ہوں گا۔

ان کے (نوع جنات) کے خیال کے مطابق یہ نئی نوع (انسان) اتنی کمزور اور ناتواں تھی کہ جنات کے لیے اسے انگلیوں پر نچانا اور انسانوں کی اکثریت کو گمراہ کرنا ان کے لیے بہت آسان تھا جیسا کہ متذکرہ بالا آیت (۱۷/۶۲) میں شیطان نے دعویٰ کیا۔ ان کے انکار کی دوسری وجہ اس نوع کے نزدیک آگ کی خاک پر برتری ہے۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ إِلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَا خَيْرٌ
مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ

(۷/۱۲)

(اللہ نے) کہا جب میں نے تجھ کو حکم دیا تو کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے باز رکھا اس نے کہا میں اس سے افضل ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے بنایا ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ یہ حکم عدولی اس نوع کی کوئی نئی نافرمانی نہیں تھی بلکہ یہ نوع پہلے ہی سے حالت کفر میں تھی۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ
ابْنِي وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝

(۲/۳۳)

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا
ما سوا ابلیس کے اس نے تکبر کیا وہ کافروں میں سے تھا۔

یہ آیت واضح طور پر اس امر پر شاہد ہے کہ نوع جنات انسانوں کی تخلیق سے قبل ہی ہر قسم کی
نافرمانی کی تمام حدود پھلانگ چکی تھی اور پہلے ہی دائرہ کفر میں تھی ورنہ کسی تابع دار اور
اطاعت گزار نوع سے حکم الہی کی اس نوعیت کی خلاف ورزی کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ امر
رب سے ان کا یہ انکار ان کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں راندہ
درگاہ قرار دے دیا۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝

(۱۵/۳۳)

(اللہ نے) کہا یہاں سے نکل جا تو راندہ درگاہ ہے۔

اس پر اس نوع نے اللہ سے قیامت تک کی مہلت طلب کی جو انہیں دے دی گئی۔

قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝

قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۝

(۱۵/۳۶-۳۸)

إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ۝

(اس نے) کہا مجھے اس دن تک کی مہلت دے جب لوگ (مرنے کے

بعد) زندہ کیئے جائیں گے کہا تجھے مہلت دی جاتی ہے وقت مقرر کے دن تک۔

تاہم اس مہلت طلبی کا مقصد کوئی نیک ارادہ نہ تھا بلکہ یہ نوع جس طرح خود اپنے اعمال کی
وجہ سے راندہ درگاہ ہوئی وہ یہ چاہتی ہے کہ انسانوں کی اکثریت کو بھی اسی طرح راہ حق سے

بھٹکا دیا جائے۔

قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ

(۱۵/۳۹)

وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ○

(اس نے) کہا میرے رب جیسا تو نے مجھے راستے سے الگ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کے لئے (گناہوں کو) آراستہ کر دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا۔

اس طرح روز ازل سے ان دونوں انواع یعنی انسانوں اور جنات میں ایک کشمکش جاری ہے جو تا قیامت جاری رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغ مصطفوی سے شرار بوریہی

اس کشمکش میں انسانوں کو شیطان پر برتری حاصل ہے بالفاظ دیگر شیطان کو انسان پر کوئی کنٹرول حاصل نہیں۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَنٌ إِلَّا مَنِ

(۱۵/۴۲)

اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَوِيْنَ ○

جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تجھے کچھ قدرت نہیں ہاں بدراہوں میں جو تیرے پیچھے چل پڑیں۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے خود شیطان نے بھی تسلیم کیا ہے۔

(۱۵/۴۰)

إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ○

ماسوا ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں۔

سورۃ بنی اسرائیل میں مکرز فرمایا گیا میرے بندوں پر تیرا (شیطان/ابلیس) کا کوئی زور نہیں۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ

(۱۷/۶۵)

جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں۔

سورۃ ص میں اس حقیقت کے بیان کا پیرایہ اظہار یہ ہے۔

إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْبٰخِلٰصِيْنَ ۝

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقُّ اَقُوْلُ ۝

لَا مُلْكَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَرَمٰنٌ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

(۳۸/۸۳ - ۸۵)

سوائے ان کے جو تیرے مخلص بندے ہیں کہنا سچ (ہے) اور میں بھی سچ کہتا ہوں

کہ میں تجھ سے اور جو تیری پیروی کریں گے سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ از روئے قرآن شیطان کو انسان پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے
ماسوا ان انسانوں کے جو خود ہی شیطان کے آلہ کار بننا چاہیں۔ تاہم ظاہر ہے ان سب کا
انجام صرف اور صرف جہنم ہے۔

وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

(۱۵/۴۳)

ان سب کے وعدے کی جگہ جہنم ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیطان اپنا یہ ہرف یعنی بنی نوع انسانی کو ورغلا نا کس طرح
حاصل کرتا ہے؟ اس حوالے سے قرآن مجید میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ وہ یہ فعل
کس طرح انجام دیتا ہے شیطان کی نوعی ساخت اس قسم کی ہے کہ وہ انسانی دماغ میں وسوسہ
اندازی کر سکتا ہے اور یہ وسوسے ہمیشہ منفی ہوتے ہیں کبھی مثبت نہیں ہو سکتے کیونکہ اسکا

مقصد ہی بنی نوع انسان کی تباہی ہے وہ انسانی افعال بد کو خوش نما بنا کر پیش کرتا ہے جس سے انسان ان افعال کی جانب مزید راغب ہوتا ہے اور اپنی بربادی کے سامان خود تیار کرتا ہے۔

شیطانی ہتھکنڈے

قرآن مجید میں خاصی تفصیل کے ساتھ ان شیطانی ہتھکنڈوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کی مدد سے شیطان انسان کو راہِ حق سے بھٹکا دیتا ہے۔ یہ شیطانی طریقے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اعمالِ بد کو خوبصورت کر کے دکھانا

شیطان انسان کو راہِ حق سے بھٹکانے کے لیے اعمالِ بد کو خوبصورت کر کے دکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام اعمالِ بد اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتے ہیں اور انسان اگر اپنے اوپر کنٹرول نہ رکھے تو اس کے بہک جانے کے تمام سامان شیطان فراہم کر دیتا ہے۔ وہ انسان کو بدی اور ناپسندیدہ باتوں کا حکم دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوتِ الشَّيْطَانِ وَمَنْ يَتَّبِعْ
خُطُوتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ
وَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَا مِنْكُمْ مَن
أَحَدٌ أَبَدًا وَلَكِنَّ اللَّهَ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

(۲۴/۲۱)

اے اہل ایمان! شیطان کے قدموں پر نہ چلنا اور جو شخص شیطان کے قدموں پر چلے گا تو وہ جان لے کہ شیطان بدی اور فحش باتوں کا حکم دیتا ہے اور اگر اللہ کا تم پر فضل اور رحم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی پاکباز نہ ہوتا لیکن جو چاہے وہ اللہ کے قانون کے مطابق پاکباز ہو جائے وہ بہت سمیع اور علیم ہے۔

اس آیت کی رو سے شیطان فحش باتوں کا حکم دیتا ہے۔ فحش سے مراد حد سے بڑھنا یا زیادتی کر بیٹھنا کے ہوتے ہیں۔ گفتگو یا معاملات میں حدود سے تجاوز کرنے کو بھی فحش کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ عدل کے مقابلے میں آیا ہے (۱۶/۹۰) اور قسط کے مقابلے میں بھی (۲۹-۲۸/۷)۔ قسط کے معنی اللہ کی اطاعت کے ہیں اس بنیاد پر فحش کے معنی تجاوز یا سرکشی کے ہوتے ہیں، یعنی اللہ کے احکامات کی حکم عدولی یا کوئی اور ذلیل یا شرمناک حرکت (۲/۱۳۴)۔ فحشا کے معنی بخل کے ہوتے ہیں بخیل کو فاحش کہتے ہیں ان معنوں میں یہ لفظ قرآن مجید میں فضل کے مقابلے میں آیا ہے (۲/۲۶۸)۔ فضل کے معنی رزق کی کشائش یا وسعت کے ہوتے ہیں اس حوالے سے فحش کے معنی رزق کی تنگی کے ہوں گے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں زنا کو فاحشة میں شمار کیا گیا ہے (۱۷/۳۲)۔ تاہم لفظ فواحش کو ہر قسم کی حدود شکنی اور بے حیائی کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے سورۃ الانعام میں ہے ولا تقر بوا الفواحش ما ظہر منها وما بطن (۶/۱۵۲) ”تم فواحش کے قریب مت جاؤ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ“ لہذا فواحش میں ہر قسم کی حدود شکنی اور بے حیائی آجاتی ہے۔

مذکرہ بالا آیت (۲۴/۲۱) میں فحشاء کے ساتھ منکر کا تذکرہ کیا گیا ہے منکر کا مادہ ن ک ر ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ چالاکی، فریب کاری۔

گویا شیطان، انسان کو فواحشات اور منکرات کی طرف راغب کرتا ہے لیکن اگر اللہ کی مدد شامل حال نہ ہو تو انسانوں میں سے کوئی بھی نشوونما یا بالیدگی حاصل نہیں کر سکتا تھا یعنی انسانی نفس کی نشوونما ممکن ہی نہیں تھی۔ ہر قسم کا فعل بد، خواہ اس کی نوعیت و ماہیت کچھ ہی کیوں نہ ہو نفس انسانی میں ضعف پیدا کر دیتا ہے اور شیطان کا مقصد ہی نوع انسانی کی تباہی

ہے۔ اب اگر اللہ کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو پوری نوع انسانی شیطان کے جال میں آ کر اپنے نفوس کو برباد کر بیٹھتی۔ یہ صرف اور صرف اللہ کا کرم اور اس کی رحمت ہے جس کی مدد سے انسان اگر خود بچنا چاہے تو ان شیطانی ہتھکنڈے سے بچ سکتا ہے۔

۲۔ فساد فی الارض

نوع انسانی کو اس کے اصل مقصد سے بھٹکانے کے لیے یعنی تقویٰ کی راہ سے ہٹانے کے لیے شیطان کا ایک اور حربہ فساد فی الارض یعنی زمین میں فساد پھیلانا ہے۔

وَأَنَّ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّيْطَانَ
يُزَيِّرُ بَيْنَهُمْ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَلِيًّا وَّابِينًا

(۱۷/۵۳)

اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہا کریں جو سب سے پسندیدہ ہوں
کیونکہ شیطان یقیناً ان کے درمیان فساد ڈالتا رہتا ہے اور بے شک شیطان
انسان کا کھلا دشمن ہے۔

اس آیت کی رو سے انسانوں کے درمیان فساد کی ایک بڑی وجہ شیطان ہے۔ فساد صلاح کی
ضد ہے صلاح کے معنی ہیں حالات کا مستقیم و متوازن رہنا لہذا فساد کے معنی ہیں توازن کا
بگڑ جانا یا بے ترتیب ہو جانا۔ قرآن مجید میں مختلف افعال بد کو فساد سے تعبیر کیا ہے مثلاً حرث
و نسل کی تباہی (۲/۲۰۵) ناپ تول پورا نہ رکھنا، دوسروں کی محنت کا پورا معاوضہ نہ
دینا، معاشی ناہمواریاں پیدا کرنا، لوگوں کے حقوق دبا لینا یہ سب فساد ہے
(۷/۸۵، ۳۶/۱۸۳)، صالح نظام کو درہم برہم کر دینا صحیح ترتیب کو الٹ دینا بھی فساد ہے

(۲۷/۳۴)، ارتکابِ جرم بھی فساد ہے (۱۲/۷۳)، یتیموں کے معاملات کی اصلاح نہ کرنا (۲/۲۲۰)، صدقاتوں کا انکار اور لوگوں کو راہِ خدا سے روکنا (۱۶/۸۸)، خدا سے کیے گئے عہد کو توڑنا اور انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا (۲/۲۷، ۱۳/۲۵)، سرمایہ دارانہ ذہنیت (۲۸/۷۷)، خدا اور رسول کے خلاف بغاوت (۵/۳۳)، مخالفین کو جہاد کے ذریعے نہ روکنا (۸/۷۳)، جنگ کی آگ بھڑکانا (۵/۶۴)، غیر فطری جنسی افعال (۲۹/۳۰) وغیرہ کو فساد کہا گیا ہے۔ فساد خواہ کسی بھی نوعیت کا ہو اس کا اول آخر انجام صرف تباہی ہوتا ہے۔

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ
عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ۝

(۱۶/۸۸)

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا ہم ان کو عذاب دیں گے اس لیے کہ وہ فساد کیا کرتے تھے۔

مذکورہ بالا تمام افعال جنہیں قرآن مجید میں فساد قرار دیا گیا ہے نوعِ انسانی کی انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر بربادی لاتے ہیں اور یہ سب شیطان کی وجہ سے ہوتا ہے۔ وہ انسانوں کو ان افعال پر اُکساتا ہے اور انسان اگر اپنے آپ پر قابو نہ رکھے تو شیطان کی یہ اُکساہٹ موجب فساد بن جاتی ہے۔

۳۔ راہِ ہدایت سے ورغلانا

شیطان اپنے مذموم مقاصد کے لیے راہِ ہدایت پر چلنے والے لوگوں کو ورغلاتا ہے اور انہیں راہِ حق سے بھٹکانے کی کوشش کرتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ
لَهُمُ الْهُدَىٰ ۗ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ۝
(۲۷/۲۵)

جو لوگ راہ ہدایت ظاہر ہونے کے بعد پیٹھ دے کر پھر گئے شیطان نے انہیں یہ
کام مزین کر کے دکھایا اور انہیں (جھوٹی) امیدیں دلوائی ہیں۔

ایسے لوگ جن پر راہ مستقیم کی حقانیت ظاہر ہوگئی اور انہوں نے اسے قبول بھی کر لیا ایسے
لوگوں کو راہ حق سے ورغلانے کے لیے شیطان انہیں ان کی گذشتہ غلط راہ کو مزین کر کے
دکھاتا ہے کیونکہ اسلام کی راہ بالفاظ دیگر تقویٰ کی راہ کوئی آسان کام نہیں جبکہ کوئی بھی ایسی
راہ جو راہ حق نہ ہو بہر حال فوری لذت کی حامل ہوتی ہے لہذا اس فوری لذت کی غیر از حق
راہ کو چھوڑ کر راہ حق اختیار کرنا آسان کام نہیں ہوتا اقبال کے الفاظ میں:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

ایسے لوگوں کو ورغلانا شیطان کے لیے آسان ہوتا ہے لہذا وہ انہیں راہ حق سے فرار کی راہیں
خوشنما کر کے دکھاتا ہے تاکہ انہیں راہ حق سے ہٹایا جاسکے۔ نہ صرف ایسے لوگ جن پر راہ حق
کی سچائی پہلی مرتبہ واضح ہوئی ہو بلکہ ایسے لوگ بھی جو پہلے سے ہی اس راہ کے مسافر ہوں
شیطان انہیں بھی نہیں بخشتا اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ ان لوگوں کو بھی راہ حق سے
ہٹایا جائے۔

وَلَا يَصُدُّكُمْ الشَّيْطَانُ، إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝
(۲۳/۶۲)

اور کہیں شیطان تم کو اس راہ (ہدایت) سے روک نہ دے وہ تمہارا اعلانیہ دشمن ہے۔

ایسے لوگ جو راہ حق سے ہٹ جائیں وہ شیطان کی وسوسہ انگیزیوں کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت پاگئے ہیں حالانکہ وہ تاریک راہوں کے مسافر ہوتے ہیں۔

فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ
إِنَّهُمْ اتَّخَذُوا الشَّيْطَانَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ
وَ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُّهْتَدُونَ ○

(۷/۳۰)

ایک فریق کو تو اس نے ہدایت دی اور ایک فریق پر گمراہی ثابت ہو چکی ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق بنا لیا ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت پاگئے ہیں۔

شیطان کا ورغلا نے کا یہ عمل امم سابقہ کے ساتھ بھی تھا۔

تَاللَّهِ لَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ
لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

(۱۶/۶۳)

اللہ کی قسم ہم نے تم سے پہلی امتوں کی طرف رسول بھیجے تھے پھر انہیں شیطان نے ان کے (بد) اعمال خوبصورت کر کے دکھائے سو آج بھی وہی ان کا دوست ہے ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔

سورۃ العنکبوت میں عاد اور ثمود کی شیطان کے ہاتھوں بربادی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے۔

وَعَادًا وَثَمُودًا وَقَدْ تَبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّا كُنْتُمْ
تَعْمَلُونَ لَكُمْ آيَاتٌ فَكُنْتُمْ مُّسْتَكْبِرِينَ
وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ

السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ۝

(۲۹/۳۸)

اور عاد اور ثمود کو بھی (ہم نے ہلاک کر دیا) چنانچہ ان کے گھر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں اور شیطان نے انہیں ان کے اعمال آراستہ کر کے دکھائے۔ اور ان کو (سیدھے) راستے سے روکا حالانکہ وہ خوب سمجھتے تھے۔

گویا شیطان کا یہ عمل ایک مسلسل عمل ہے جو کل بھی جاری تھا، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ شیطان کی طاقت (غلط کاموں کی طرف رجحانے کا عمل) اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ ایسے لوگ بھی جو اس دھوکے کو سمجھتے ہیں اس کا علم رکھتے ہیں وہ بھی اس کے جھانے میں آجاتے ہیں۔ متذکرہ بالا آیت (۲۹/۳۸) میں اس امر کی صریح وضاحت موجود ہے کہ عاد و ثمود جاننے والوں میں سے تھے۔ لفظ مستبصرین کا مادہ ب ص ر ہے اس کی بنیادی معنی جان لینے کے ہوتے ہیں، یہ مادہ ادراک، ذہانت و فطانت، حجت اور دلیل کے معنی رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عاد و ثمود اس حقیقت سے واقف تھے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے لیکن اس کے باوجود اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رکھ سکے اور شیطانی جال میں آکر تباہ و برباد ہو گئے اور یہی صورت حال آج بھی ہے آج بھی شیطان کا یہی عمل جاری ہے اور ایسے تمام لوگ جو اس شیطانی جال میں پھنس جاتے ہیں ان کے لیے ایک ابدی عذاب مقدر ہوتا ہے۔

۴۔ وسوسہ اندازی

وسوسے پیدا کرنا ایک مخصوص شیطانی عمل ہے

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝

الَّذِي يُوسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

(۱۱۳/۳-۶)

میں اس کی پناہ طلب کرتا ہوں ہر وسوسہ ڈالنے والے کی شرارت سے جو (وسوسے ڈال کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے جو انسانی سینے میں وسوسے پیدا کرتا ہے خواہ وہ جنات میں سے ہو یا عام انسانوں میں سے۔

بالفاظ دیگر وسوسہ اندازی ایک شیطانی عمل ہے شیطان انسان کے قلب میں مختلف قسم کے وسوسے پیدا کر کے انہیں راہ ہدایت سے برگشتہ کر دیتا ہے۔

۵۔ محتاجی کا خوف اور بے حیائی کی تلقین

رزق انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ہے اور رزق کا حصول آمدنی کے ذریعے ہی ممکن ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ آمدنی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں تاہم کسی بھی صورت میں اللہ کے احکامات سے روگردانی کی اجازت نہیں۔ تاہم شیطان انسان میں محتاجی کا خوف پیدا کر کے اسے غلط راہ پر لے جاتا ہے۔ دوسری طرف جنس انسان کا کمزور ترین پہلو ہے اور انسانوں کی بہت بڑی اکثریت کو اس ”کھلونے“ سے باآسانی سے بہلایا جاسکتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تاہم عورتوں کے مقابلے میں مرد اس فطری کمزوری کی وجہ سے شیطان کا زیادہ آسان تر نوالہ ثابت ہوتے ہیں۔ اور انسانوں کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر وہ انہیں گمراہی کی راہ پر لے جاتا ہے۔

(۲/۲۶۸)

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ ۗ

شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کی تلقین کرتا ہے۔

۶۔ نمود و نمائش اور اسراف کی ترغیب

ایک اور شیطانی ہتھکنڈہ جس کی طرف قرآن مجید ہماری توجہ مبذول کرواتا ہے وہ نمود و نمائش پر رقم اور دولت کا زیاں اور عمومی اسراف کی ترغیب ہے ایسے لوگوں کو اللہ نے شیطان

کا ساتھی قرار دیا ہے۔

وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا
يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَنْ يَكُنْ
الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا ۝

(۴/۳۸)

جو لوگ اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ یوم آخرت پر اور جس کا شیطان ساتھی ہو وہ بہت برا ساتھی ہے۔

جس طرح اس آیت میں نمود و نمائش کرنے والوں کو شیطان کا ساتھی قرار دیا گیا ہے اسی طرح مسرفین کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے۔

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ ط وَكَانَ الشَّيْطَانُ
لِرَبِّهِ كَفُورًا ۝

(۱۷/۲۷)

اسراف کرنے والے لوگ یقیناً شیطان کے بھائی ہوتے ہیں اور شیطان اپنے رب کا بہت ناشکر ہے۔

۷۔ حرام صرف کی ترغیب:

اللہ تعالیٰ نے زمین میں انسانوں کے لیے ان گنت انواع و اقسام کی نعمتیں پیدا کی ہیں اور ماسوا چند اشیاء کے کسی شے کو حرام قرار نہیں دیا۔ تاہم حلال جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا لازمی ہے اور جس جانور پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہو وہ حرام ہے۔ شیطان اول تو انسان کو ان اشیاء کو کھانے کی ترغیب دیتا ہے جو بذات خود حرام ہیں یہ فعل بذات خود شیطان کی پیروی کے مترادف ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا
تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝

(۲/۱۶۸)

اے لوگو جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے جو کچھ حلال اور طیب ہے اسے کھاؤ
اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

دوسری طرف وہ ایسی اشیاء کھانے کی ترغیب دیتا ہے جن پر ذبیحہ کے وقت اللہ کا نام نہیں لیا
گیا ہوتا یہ کھلی نافرمانی ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْثَالَهُمْ يُذَكِّرُ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ
وَإِنَّ الشَّيْطَانَ لِيُوحِيَ إِلَيْكُمْ لِتُجَادُوا لُوْكُمْ
وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ۝

(۶/۱۲۱)

اور تم اس میں سے جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا مت کھاؤ یہ فعل یقیناً نافرمانی ہے
اور شیطان یقیناً اپنے دوستوں کے دل میں ایسے خیال ڈالتے رہتے ہیں تاکہ وہ
تم سے جھگڑیں اور تم ان کی اطاعت کرو گے تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے۔

۸۔ ادھاتیر ادھا بئیر

اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں قطعی حکم ہے کہ تم اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ (۱۲۰۸/۲)
لیکن شیطان اس حکم کی خلاف ورزی پر انسانوں کو اگساتا ہے اس کی پوری پوری کوشش
یہ ہوتی ہے کہ انسان نہ ادھر کار ہے نہ ادھر کا یعنی ادھاتیر ادھا بئیر۔ اس صورت میں انسان
اللہ کے احکام سے اپنے من پسند احکام تولے لیتا ہے لیکن جن کو قبول نہیں کرنا چاہتا یا جن

کے قبول کرنے سے نفس پر جبر لازم آتا ہے انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے قبول نہیں کرتا یا اگر قبول کرتا ہے تو اس انداز میں کہ ان احکام کی اصل روح ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً اسلام کی ایک سیدھی سی تعلیم ہے کہ معاوضہ صرف محنت کا ہے قرآن مجید کا واضح حکم ہے۔

وَإِن لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۝
(۵۳/۳۹)

انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کے لیے اس نے سعی کی۔

اس آیت کی بنیاد پر صرف اور صرف محنت کا معاوضہ جائز ٹھہرتا ہے لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے زمین کا لگان، کرایہ سب جائز قرار دے دیا ہے۔ حتیٰ کے مضاربہ جو سود کی بدترین شکل ہے اسے محض لفظی الٹ پھیر سے حلال قرار دے کر ہر سمت سے سود کا دروازہ کھول دیا ہے۔ یہ قرآن کی معنوی تحریف کی بدترین مثال ہے۔ اگر معاوضہ صرف محنت کا تسلیم کیا جائے جو قرآنی حکم ہے تو ہماری مذہبی پیشوائیت کو بھی محنت کرنی ہوگی اور ان کے حلوے مانڈے ختم ہو جائیں گے جو ظاہر ہے انہیں قبول نہیں۔ لہذا صرف قرض کا سود حرام قرار دے کر باقی ہر قسم کے سرمایے کا معاوضہ جائز قرار دے دیا گیا ہے یہ آدھا تیرا آدھا بیٹر کی مثال ہے۔ یہ محض شیطانی طرز عمل ہے جس سے واضح طور پر مجتنب رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً مَّوَلَا
تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝
(۲/۲۰۸)

اے اہل ایمان! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

۹۔ ڈرا اور خوف:

ڈرا اور خوف پیدا کرنا ایک اور شیطانی حربہ ہے جبکہ جس ہستی سے ڈرنا چاہیے وہ صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے۔

إِنَّمَا ذَلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ
وَخَافُوا اللَّهَ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

(۳/۱۷۵)

یہ (خوف ڈالنے والا) تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے اگر تم
مومن ہو تو ان سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا۔

۱۰۔ راہ ہدایت سے روکنا:

راہ ہدایت سے روکنا اور اس مقصد کے لیے اعمال بد کو خوش نما بنا کر پیش کرنا بھی ایک شیطانی
طریقہ ہے جس سے وہ انسانوں کے لیے راہ ہدایت کا حصول ناممکن نہیں تو بے پناہ مشکل
ضرور بنا دیتا ہے۔

وَجَدْتُهُمْ قَوْمًا يَسْبُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَزَيْنًا لَهُمْ
الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ۝

(۷/۲۲)

میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور
شیطان نے ان کے اعمال انہیں آراستہ کر کے دکھائے ہیں اور ان کو سچے راستے
سے روک دیا ہے جس کی وجہ سے وہ ہدایت نہیں پاتے۔

۱۱۔ گمراہ عالم:

علم بلاشبہ انبیاء کا ورثہ ہے یہ دولت جس کو بھی ملے وہ خوش نصیب ہوتا ہے لیکن اس کی خوش نصیبی کے کیا کہنے جسے اللہ کی آیات (نشانیوں) کا علم حاصل ہو لیکن یہ انتہائی خوش نصیبی اس وقت انتہائی بد نصیبی میں بدل جاتی ہے جب اس علم کا حامل شخص شیطان کے قابو میں آجاتا ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَاسْتَكْبَرَ
مِنْهَا فَاتَّبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَوِينَ ۝

(۷۱/۷۵)

اور ان کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنا دو جس کو ہم نے اپنی آیات عطا فرمائیں تو اس نے ان کو اتار دیا پھر شیطان اس کے پیچھے لگا تو وہ گمراہوں میں ہو گیا۔

یہ آیت اپنے اندر معانی کا ایک جہان لیے ہوئے ہے۔ ایسے عالم جو شیطانی راہ پر چل نکلیں وہ خود تو گمراہ ہوتے ہی ہیں یہ انفرادی سطح ہے لیکن جب علم ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلا جائے جو شیطان کے پیروکار ہوں تو وہ اس علم کو بھی انسانیت سوز کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ علم کا انتہائی غلط استعمال ہے جو انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے تباہ کن ہے۔

۱۲۔ بغیر علم کے بحث کرنا:

ازروئے قرآن اللہ کے بارے میں ایسی بحث جس میں بحث کر نیوالے کو خود اللہ کے بارے میں علم نہ ہو ایک شیطانی فعل ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّبِعُ
كُلَّ شَيْطَانٍ مَرِيدٍ ۝

(۲۲/۳)

اور لوگوں میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم کے

بحث کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کی پیروی کرتے ہیں۔

۱۳۔ منافقت

قرآن، منافقت کو شیطانی فعل قرار دیتا ہے۔ منافق وہ لوگ ہوتے ہیں جو مسلمانوں میں ہوں تو بظاہر مسلمانوں کے ہوتے ہیں اور جب کفار میں جاتے ہیں تو انہیں کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ
شَيْطَانِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ ۝

(۲/۱۴)

اور یہ لوگ جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں (تو ان سے) کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور (مسلمانوں سے) تو ہم استہزاء کرتے ہیں۔

منافق اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی نظام یا سوسائٹی میں داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ اس سے باہر نکلنے کا راستہ کون سا ہے۔ یہ معاشرے کے سب سے خطرناک ترین افراد ہوتے ہیں۔ یہ محض مطلبی لوگ ہوتے ہیں جہاں ان کا مفاد پورا ہوتا ہو انظر آئے یہ وہ ہیں کے ہورہتے ہیں۔ ان کے نزدیک جماعتی مفاد یا اجتماعی جدوجہد کوئی معنی نہیں رکھتی اور کسی بھی مشکل لمحے میں جماعت یا نظام کا ساتھ چھوڑنے میں انہیں کوئی عار نہیں ہوتا۔ یہ بدترین خلائق ہیں اسی وجہ سے قرآن مجید نے ان کا مقام جہنم کا سب سے نچلا طبقہ بتایا ہے۔

إِنَّ الْمُنْفِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ
وَلَكِنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ۝

(۴/۱۳۵)

کچھ شک نہیں کہ منافق دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تم ان کا کسی کو مددگار نہیں پاؤ گے۔

۱۳۔ حرام ذرائع رزق کی ترغیب

وہ ذرائع رزق جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے شیطان انہی کی انسان کو ترغیب دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ
وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ
لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ۝

(۵/۹۰)

اے اہل ایمان! شراب، جوا، بت اور پانے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے اجتناب کرو تا کہ فلاح پاؤ۔

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ
فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ
الصَّلَاةِ، فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝

(۵/۹۱)

شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوادے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تم کو (ان کاموں سے) مجتنب رہنا چاہئے۔

۱۵۔ بھول اور نسیان

شیطانی ہتھکنڈوں میں سے ایک بھول اور نسیان بھی ہے شیطان ایسے اہم مواقع پر انسان کو چیزیں بھلا دیتا ہے۔ جس وقت ان کی شدید ضرورت ہوتی ہے یا اس بھول سے بھاری نقصان کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اسی شیطانی حربے کی وجہ سے کئی برس جیل میں اسیر رہے۔

وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ
فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ ۝

(۱۲/۲۲)

اور دونوں اشخاص میں سے جس کی نسبت (یوسف) نے خیال کیا کہ وہ رہائی پا جائے گا اس سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر بھی کرنا لیکن شیطان نے ان کا اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا اور (یوسف) کئی برس جیل خانے ہی میں رہے۔

اسی طرح سورۃ الکہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفر کے دوران انکا ساتھی جب کھانا سفر میں رکھ کر بھول گیا تو اسے بھی شیطان ہی سے منسوب کیا گیا ہے۔

وَكذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَاطِئِينَ ۗ الْإِنسِ
وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ
غُرُورًا ۗ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ ۗ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ۝

(۱۸/۶۳)

(اس نے) کہا بھلا آپ نے دیکھا کہ جب ہم نے پتھر کے پاس آرام کیا تھا تو میں مچھلی (وہیں) بھول گیا اور مجھے (آپ سے) اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا اور اس نے عجب طرح سے ذریا میں اپنا راستہ لیا۔

۱۶۔ خدا کے ذکر سے غافل کر دینا

شیطان لوگوں کو خدا کے ذکر سے غافل کر دیتا ہے۔ سورۃ الفرقان میں ارشادِ باری ہے۔

لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي ۚ وَكَانَ الشَّيْطَانُ
لِلْإِنْسَانِ خَدُوْلًا ۝

(۲۵/۲۹)

اس نے مجھ کو (کتاب) نصیحت کے میرے پاس آنے کے بعد بہکا دیا اور
شیطان انسان کو وقت پر وعادینے والا ہے۔

ذکر کا لفظ قرآن مجید میں متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے اس آیت میں اسے چونکہ خود
قرآن کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور قرآن چونکہ دیگر چیزوں کے ساتھ قوانین
واحکامات کا بھی حامل ہے لہذا یہاں ذکر سے مراد اللہ کے قوانین کا اتباع ہے جس سے
شیطان بہکا دیتا ہے اور اللہ کے قوانین سے انکار یا انحراف محض تباہی ہے۔

۱۷۔ خفیہ مشورے

خفیہ مشورے کا طریقہ خالص شیطانی طریقہ ہے جس کا مقصد محض مسلمانوں کو فکر و تشویش
میں مبتلا کرنا ہے۔

إِنَّمَا النَّجْوَى مِنَ الشَّيْطَانِ لِيُبْذَرَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ

(۵۸/۱۰)

خفیہ مشورہ (سرگوشیاں) کرنے کا طریقہ شیطان کی طرف سے آیا ہے اس کی
غرض یہ ہے کہ مومنوں کو فکر میں ڈالے۔

۱۸۔ اسلاف کی تقلید

شیطانی حربوں میں سے یہ ایسا حربہ ہے جس سے سب سے زیادہ نقصان غالباً مسلمانوں کو ہی پہنچا ہے تقلید پرستی یا آبا پرستی جتنی مسلمانوں میں راسخ ہے دنیا کی شاید ہی کوئی اور قوم ایسی ہو جو اس معاملے میں ہمارا "مقابلہ" کر سکے اور از روئے قرآن بے سوچے سمجھے اسلاف کی تقلید ایک شیطانی طریقہ ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءُنَا أَوْ لَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ

(۳۱/۲۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو (کتاب) خدا نے نازل فرمائی اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر اپنے آبا و اجداد کو پایا بھلا اگر شیطان ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف بلاتا ہو (تب بھی وہ ایسا کریں گے؟)

۱۹۔ جھوٹی قسمیں اٹھانا

بار بار قسمیں اٹھانا ایک شیطانی طریقہ ہے بلکہ یہاں تک ہے کہ ایسے لوگوں کی بابت خود قرآن مجید نے گواہی دہی ہے کہ ایسے لوگوں پر شیطان غالب آجاتا ہے۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَبِينًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ وَيُسَبِّحُونَ اللَّهَ عَلَىٰ شَيْءٍ إِلَّا إِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُونَ ۝ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ اِلَّا اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُونَ

(۵۸/۱۸-۱۹)

جس دن خدا ان سب کو چلا اٹھائے گا تو جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں (اسی طرح) خدا کے سامنے قسمیں کھائیں گے اور خیال کریں گے کہ وہ بڑے پختہ اصول پر ہیں سنو یہ لوگ جھوٹے ہیں شیطان ان پر غالب آ گیا ہے اور اس نے اللہ کا ذکر ان کو بھلا دیا ہے یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں اور شیطان کا گروہ آخر میں خسارہ میں جانے والا ہے۔

۲۰۔ برے خیالات پیدا کرنا

یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ نماز میں بالخصوص برے خیالات حملہ آور ہوتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کو راہ حق سے بھٹکانے کا ایک اور شیطانی حربہ ہے۔ عام مسلمان تو درکنار اس حوالے سے یہ نوع اللہ کے پیغمبروں کو بھی نہیں بخشتی۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيْطٰنِيْنَ اِلٰي نَسِ
وَالْجِيْنَ يُوحٰى بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ
غُرُوْرًا وَّلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرُهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ

(۶/۱۱۴)

اسی طرح ہم نے شیطان (سیرت) انسانوں اور جنات کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا جو دھوکہ دینے کے لئے (ان کے دل میں) برے خیال ڈالتے ہیں جو محض ملمع کی بات ہوتی ہے اور اگر تمہارا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے تو ان کو اور جو کچھ یہ افتراء کرتے ہیں اسے نظر انداز کر دیں۔

یہ ان مختلف شیطانی ہتھکنڈوں میں سے چند کا بیان ہے جن کے ذریعے یہ نوع یعنی نوع جنات اپنے مذموم مقاصد حاصل کرتی ہے۔ تاہم قنبد مکرر کے طور پر یہ یاد رکھیں شیطان کو انسان پر برتری حاصل نہیں ہے شیطان صرف اس وقت انسان کو راہ ہدایت سے بھٹکا سکتا

ہے جب انسان خود ایسا کرنا چاہے یا درکھیے شیطان روزِ ازل تسلیم کر چکا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔

إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ ○

(۱۵/۴۰)

سوائے تیرے مخلص بندوں کے (ان پر میرا زور نہیں)۔

متذکرہ بالا طرائق وہ ہیں جو از روئے قرآن نوع جنات (شیطان) انسان کو ورغلانے اور اسے راہ ہدایت سے ہٹانے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ لیکن چونکہ انسان کو جنات پر برتری حاصل ہے لہذا انسان شیطان کے ان حملوں سے بچ سکتا ہے لیکن صرف اس صورت میں جبکہ وہ وحی الہی کی روشنی میں چلے۔ تاہم اگر انسان ایسا نہیں کرتا اور راہ ہدایت اختیار نہیں کرتا تو شیطان کو اس پر غالب آنے موقع مل جاتا ہے۔ ایسی صورت میں نفسِ امارہ جو پہلے ہی لذت کا طالب ہوتا ہے وہ بھی شیطان کا ساتھی بن جاتا ہے اور دونوں مل کر انسان کو مکمل تباہی کی راہ پرے جاتے ہیں۔ تاہم اس حوالے سے بنیادی کردارِ نفسِ امارہ کا ہوتا ہے جو شیطان کے لئے زمین زرخیز کرتا ہے اور باقی کام شیطان انجام دیتا ہے۔ اس کا سادہ سا ثبوت درج ذیل آیت قرآنی سے ملتا ہے۔

وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ
وَعَدَ الْحَقُّ وَوَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِي
عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ
لِي فَلَا تَلُمُونِي وَلَوْلَمُوا أَنفُسَكُمْ مَا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ

وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْزِزِينَ لِي كَفَرْتُمْ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِ

مِنْ قَبْلُ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۳/۲۲)

اور جب تمام معاملہ فیصل ہو جائے گا تو شیطان لوگوں سے کہے گا کہ اللہ نے یقیناً تم سے اٹل وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی تم سے ایک وعدہ کیا تھا مگر میں نے وہ وعدہ تم سے پورا نہیں کیا اور میرا تم پر کوئی تسلط نہیں تھا ہاں میں نے تمہیں اپنی طرف بلایا اور تم نے میرا کہا مان لیا اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے نفوس (امارہ) کو ملامت کرو اس وقت نہ میں تمہاری فریاد سن سکتا ہوں نہ ہی تم میری فریاد سن سکتے ہو تم نے جو مجھے اللہ کا شریک بنا رکھا تھا میں تمہاری اس بات کا پہلے انکار کر چکا ہوں بے شک ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت کریمہ میں جہاں ایک طرف واضح طور پر شیطان کی جانب سے اس حقیقت کو قبول کیا گیا ہے کہ اسے کسی انسان پر کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں تھا نہ ہے اور نہ تا قیامت کبھی ہوگا۔ شیطان صرف ترغیب و تحریریں پر قادر ہے، وہ وسوسہ اندوزی کرتا ہے، برے اعمال کو خوبصورت بنا کر انسان کو برے افعال کی جانب کرتا ہے اور اس مقصد کے لیے انسان کے نفسِ امارہ کو اپیل کرتا ہے۔ متذکرہ بالا آیت (۱۳/۲۲) میں شیطان کا انسانوں کو یہ کہنا کہ ”اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے نفوس (امارہ) کو ملامت کرو“ اس امر کا واضح اظہار ہے کہ انسان جو بھی افعال بد انجام دیتا ہے وہ اپنے نفس کے کہنے پر کرتا ہے اور نفس (امارہ) کو ترغیب شیطان کی جانب سے ملتی ہے۔ انسان اپنے نفس پر مکمل قدرت رکھتا ہے اگر وہ چاہے تو نفسِ امارہ کی تحریریں و ترغیب نظر انداز کر سکتا ہے لیکن بد قسمتی سے انسانوں کی اکثریت ایسا نہیں کر پاتی۔ دنیا کی عارضی چمک دمک انسانی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے اور وہ

دنیا کے ہی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس حقیقت کا بیان سورۃ الانعام کی مندرجہ ذیل آیات میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

لَبِعَشْرَ الْجَنِّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ
يَقُصُّونَ عَلَيْكُم مَّا بَدَأُوا مِنكُمْ لِقَاءِ يَوْمِكُمْ هَذَا
قَالُوا شَهِدْنَا عَلَىٰ أَنفُسِنَا وَغَدَّ ثُهُمُ الْحَيَاةُ
الدُّنْيَا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِم أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ۝ (٦/١٣٠)

اے جنوں اور انسانوں کی جماعت کیا تم میں سے تمہارے پاس رسول نہیں آئے جو تمہیں میری آیات پڑھ کر سنا تے تھے اور تمہیں آج کے دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے وہ کہیں گے کہ ہم خود اپنے نفوس کے خلاف گواہی دیتے ہیں دنیاوی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈال دیا اور انہوں نے اپنے نفوس کے خلاف یہ گواہی دی کہ وہ کافر تھے۔

متذکرہ بالا آیات پھر اس امر پر گواہ ہیں کہ انسانوں کو ورغلا نے میں انہیں سیدھی راہ سے بھٹکانے میں انسانوں کے اپنے نفوس ہی کلیدی کردار ادا کرتے ہیں جبھی روز قیامت جن و انس دونوں اس امر کی گواہی دیں گے کہ ان کے نفوس نے انہیں بھٹکایا اور وہ اپنے نفوس کے خلاف خود شہادت دیں گے کہ ان کی تباہی خود ان کے اپنے نفوس کی وجہ سے ہے۔ ان کے نفوس نے انہیں ورغلا یا اور وہ باوجود اپنے نفوس پر قدرت رکھنے کے اس کی ترغیب و تحریص میں آکر روزِ آخرت خسارہ پانے والوں میں ہو گئے۔

نفس امارہ کے وہ طریقے جن کی مدد سے وہ انسانوں کو راہ ہدایت سے بھٹکاتا ہے
انسانی نفس جن جن طریقوں کی مدد سے انسانوں کو راہ ہدایت سے ہٹا دیتا ہے از روئے
قرآن وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ بری باتوں کا حکم دینا

نفس (امارہ) انسان کو بری باتوں کی ترغیب دینے میں بہت مشتاق ہے

وَمَا أُبْرِيْ نَفْسِيْ ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ
إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۗ إِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۱۲/۵۳)

اور میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا کیونکہ نفس (امارہ) برائی پر ابھارنے والا
ہی ہے الا یہ کہ میرا رب ہی رحم کرے مراب یقیناً غفور اور رحیم ہے۔

اس آیت پر گذشتہ صفحات میں بحث کی جا چکی ہے

۲۔ اعمال بد کو خوبصورت کر کے دکھانا

نفس امارہ کا انسانوں کو راہ ہدایت سے بھٹکانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ یہ اعمال بد کو
انسانوں کو مزین کر کے دکھاتا ہے جس سے انسان ان افعال کی جانب مزید راغب ہوتے
ہیں اور بتدریج تباہی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ اس حوالے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے قصے میں سامری کے اعتراف جرم پر مبنی قول توجہ طلب ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ ۝

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ
 فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ
 فَنَبَذْتُهَا وَكَذَلِكَ سَوَّلَتْ لِي
 نَفْسِي ۝

(۲۰/۹۵-۹۶)

موسیٰ (علیہ السلام) نے پوچھا سامری تیرا کیا معاملہ ہے اس نے کہا میں نے
 ایک ایسی شے دیکھی جو اوروں نے نہیں دیکھی تو میں نے فرشتے کے نقش پا سے
 ایک مٹھی بھری اور اسے اس میں ڈال دیا میرے نفس نے اس کام کو میرے لئے
 خوشنما بنا دیا۔

بالفاظ دیگر نفسِ امارہ برے کاموں کو انسانوں کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس
 حوالے سے یہ امر بھی نوٹ کیئے جانے کے قابل ہے کہ قرآن مجید میں جن شیطانی
 ہتھکنڈوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اس میں بھی یہ عمل شامل ہے کہ شیطان برے کاموں کو
 انسانوں کے سامنے مزین کر کے پیش کرتا ہے اور برے اور ناپسندیدہ افعال کی جانب
 راغب کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَنْ يَتَّبِعْ
 خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ
 وَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَا مِنْكُمْ مِّنْ
 أَحَدٍ أَبَدًا وَلَكِنَّ اللَّهَ يُزَكِّي مَنِ يَشَاءُ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

(۲۴/۲۱)

اے اہل ایمان! شیطان کے قدموں پر نہ چلنا اور جو شخص شیطان کے قدموں پر
 چلے گا تو وہ جان لے کہ شیطان بدی اور فحش باتوں کا حکم دیتا ہے اور اگر اللہ کا تم
 پر فضل اور رحم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی پاکباز نہ ہوتا لیکن جو چاہے وہ اللہ کے

قانون کے مطابق پاکباز ہو جائے وہ سمیع اور علیم ہے۔

اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ خود نفس (امارہ) اور شیطان مل کر انسان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور یہ حملہ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ اگر انسانوں پر اللہ کا خاص رحم و کرم اور فضل نہ ہوتا تو اس آیت کی رو سے تمام انسان گمراہ ہو جاتے۔ صرف اس حقیقت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نفس امارہ اور شیطان کا یہ مشترکہ حملہ کس قدر طاقتور ہوتا ہے کہ اللہ کے خاص فضل و کرم سے ہی اس سے نجات ممکن ہے تاہم یہ فضل و کرم بھی صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اس حوالے سے اللہ کی مدد چاہیں وہ بے شک سمیع اور علیم ہے اور بے شک بار بار توبہ قبول کرنے والا بھی ہے۔ تاہم اگر کوئی خود ہی ایسا نہ چاہے یعنی اللہ سے رجوع نہ کرے تو وہ یقیناً تمام عالمین سے بے نیاز بھی ہے۔

اس حوالے سے جو لوگ اللہ سے رجوع نہیں کرتے وہ اس حملے میں خس و خاشاک ہو جاتے ہیں اور نفس (امارہ) اور شیطان کی غلامی میں چلے جاتے ہیں یہ دونوں ان کے اعمال بد کو خوبصورت بنا کر پیش کرتے چلے جاتے ہیں اور انسان برائیوں کی دلدل میں مسلسل پھنستا چلا جاتا ہے۔ اس امر پر پوری انسانی تاریخ شاہد ہے اور غالباً آج کے دور میں تو یہ رقص ابلیس اپنے پورے عروج پر ہے۔ جب خوف خدا اور آخرت پر یقین ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ فطرت خلا سے نفرت کرتی ہے جب ذہن انسانی میں خوف خدا اور آخرت میں جواب دہی کے تصور کا اخراج ہوگا تو یہ جگہ انسانی خواہشات، حُب دنیا اور دیگر پست خواہشات لے لیتی ہیں اور حیوانیت اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ اپنے رقص برہنہ میں مصروف ہو جاتی ہے جو آج کی پوری دنیا کا لمبہ ہے۔

شیطان اپنے مذموم مقاصد کے لئے راہ ہدایت پر چلنے والے لوگوں پر بھی یہی حربہ استعمال

کرتا ہے اور انہیں اس راہ سے اسی طریقے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ
لَهُمُ الْهُدَىٰ ۗ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ۝

(۲۷/۴۵)

جو لوگ راہ ہدایت ظاہر ہونے کے بعد پیٹھ دے کر پھر گئے شیطان نے انہیں یہ

کام مزین کر کے دکھایا اور انہیں (جھوٹی) امیدیں دلائی ہیں۔

ایسے لوگ جو راہ حق کو جان گئے اور اسے قبول بھی کر لیا ایسے لوگوں کو ان کی پرانی راہ پر لانے

کے لئے شیطان انہیں ان کی گذشتہ غلط راہوں کو خوشنما بنا کر دکھاتا ہے کیونکہ اسلام کی راہ پر

تقویٰ کی راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے جبکہ کوئی بھی ایسی راہ جو فوری لذت کی حامل ہو انسان

اس کی طرف فوری لپکتا ہے۔ لہذا شیطان انسان کو طویل المعیاد نتائج کی راہ (راہ ہدایت

سے فوری مفاد کی راہ کی جانب لانا چاہتا ہے اور اسے مزین کر کے دکھاتا ہے تاکہ مسلمان راہ

ہدایت سے بھٹک جائیں۔ اس طرح شیطان اور نفس (امارہ) مل کر دونوں انسانوں کی مکمل

تباہی کا سامان مہیا کر دیتے ہیں۔

۳۔ نفس خود غرضی کی جانب راغب کرتا ہے

نفس امارہ کا ایک اور منفی ہتھکنڈہ انسان کو نخل کی جانب راغب کرنا بھی ہے۔

وَأَحْضَرْتَ الْأَنْفُسَ الشَّعْرَةَ

(۲/۱۲۸)

اور نفس خود غرضی کی جانب مائل ہوتے ہیں۔

آیت (۲/۱۲۸) کے ان چند الفاظ میں انسانی زندگی کی ایک بنیادی حقیقت بیان کر دی گئی

ہے۔ ان الفاظ میں لفظ شیخ کا مادہ ش ح ح ہے جس کی معنی بدترین قسم کی خود غرضی کے ہوتے ہیں اس میں بخل (کنجوسی) اور حرص دونوں شامل ہوتے ہیں۔ بخل صرف مال میں ہوتا ہے لیکن شیخ سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ہر قسم کی بھلائیوں کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لینا اور دوسروں تک ان کو پہنچنے نہ دینا اور یہ عمل فطرت میں شامل ہو۔ اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نفسِ امارہ انسان کو اس جانب مائل کرتا ہے کہ وہ تمام دنیا کی نعمتیں اپنے لیے مخصوص کر لے اور کسی کو اس سے کوئی منفعت نہ پہنچے۔ یہ ایک عام انسانی طرز عمل ہے جس کا عام مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ لوگ تمام نعمتوں کو صرف اور صرف اپنے لیے مخصوص کر لینا چاہتے ہیں چاہے دوسروں کو اس سے کتنی ہی اذیت کیوں نہ ہو۔ اس ترغیب میں شیطان بھی نفسِ امارہ کے قدم بہ قدم ساتھ ساتھ ہوتا ہے کیونکہ از روئے قرآن مختلف قسم کے شیطانی ہتھکنڈوں میں ایک ہتھکنڈہ دعوتِ بخل بھی ہے۔

النَّبِيُّ يُعَبِّدُكُمْ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ

(۲/۲۶۸)

شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا اور بے حیائی کی تلقین کرتا ہے۔

گویا اس حوالے سے بھی نفسِ امارہ اور شیطان دونوں کا طرز عمل بالکل یکساں ہوتا ہے۔

۲۔ وسوسے پیدا کرنا:

نفسِ امارہ کا ایک اور منفی فعل مختلف قسم کے وسوسے پیدا کرنا بھی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَتَعَلَّمَ مَا تُوسُّوسُ بِهِ نَفْسُهُ

(۵۰/۱۶)

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو اس کا نفس وسوسے پیدا کرتا ہے ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔
 نفس امارہ کے اس فعل میں بھی شیطان اس کا قریبی ساتھی ثابت ہوتا ہے اور وہ اس عمل کو مزید شہ دیتا ہے کیونکہ یہ اس کا ایک مخصوص فعل ہے۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝

الَّذِي يُوسِّسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

(۱۱۴/۴-۶)

(میں اس کی پناہ طلب کرتا ہوں) ہر وسوسہ ڈالنے والے کی شرارت سے جو (وسوسے ڈال کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے (خواہ وہ) جنات سے ہو یا انسانوں میں ہے۔

ان وسوسوں کی نوعیت کچھ بھی ہو سکتی ہے اور یہ وسوسے اس وقت خطرناک ثابت ہوتے ہیں جب یہ راہ ہدایت سے برگشتہ کرنے والے ہوں۔ یہ وسوسے محتاجی کے خوف اور بے حیائی کی تلقین کی صورت میں بھی ہو سکتے ہیں۔

۵۔ نفس (امارہ) عدل سے ہٹا دیتا ہے:

نفس (امارہ) کی ایک منفی خصوصیت ازروئے قرآن یہ بھی ہے کہ یہ راہ عدل سے برگشتہ کر دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوْمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ
 لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ، إِنَّ

يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَإِنَّهُ أُولَىٰ بِهِيَآئِكَ فَلَا تَتَّبِعُوا
 الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلَوَّا أَوْ تَعْرَضُوا فَإِنَّ اللَّهَ
 كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝

(۴/۱۳۵)

اے اہل ایمان عدل پر قائم رہو اور اللہ کے لیے سچی گواہی دو خواہ (اکیس) تمہارا
 یا تمہارے ماں باپ اور رشتے داروں کا نقصان ہی ہو اگر کوئی امیر ہے یا فقیر اللہ
 ان کا خیر خواہ ہے تو تم خواہش نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑ دینا اگر تم
 پیچدار شہادت دو گے یا (شہادت سے) بچنا چاہو گے تو جان رکھو کہ اللہ تمہارے
 تمام کاموں سے واقف ہے۔

عدل کے بنیادی معنی ہیں برابر ہونا اور برابری کے لیے توازن لازمی ہے کسی کو پورا پورا
 معاوضہ دے دینا بھی عدل ہے۔ انسان اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے عدل کی راہ
 چھوڑ دیتا ہے اور افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں اسی طرز عمل سے مجتنب
 رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ گواہی ہر صورت میں سچی دینی چاہیے چاہے اس سے ذاتی یا اہل و
 عیال کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔

۶۔ نفس (امارہ) اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی پر اکساتا ہے۔

از روئے قرآن نفس (امارہ) اللہ اور اس کے رسولوں کے احکامات کو پسند نہیں کرتا اور انسان
 کو ان کی خلاف ورزی پر مائل کرتا ہے بالفاظ دیگر اللہ کی متعینہ حدود کو توڑنے پر انسان کو
 اکساتا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ
بِالرُّسُلِ، وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ
بِرُوحِ الْقُدُسِ، أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى
أَنْفُسُكُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ، فَفَرِّقًا كَذَّبْتُمْ، وَقَرِيبًا تَقْتُلُونَ ۝ (۲/۸۷)

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی اور ان کے پیچھے یکے بعد دیگرے رسول بھیجتے
رہے اور عیسیٰ ابن مریم کو کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس (جبرئیل علیہ السلام)
سے ان کو مدد دی تو جب کوئی رسول تمہارے پاس ایسی باتیں لے کر آئے جن کو
تمہارا نفس پسند نہیں کرتا تھا تو تم سرکش ہو جاتے اور ایک گروہ انبیاء کو تو جھٹلاتے
دے اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔

اس آیت (۲/۸۷) میں بدیہی طور پر خطاب بنی اسرائیل سے ہے اور ان کے منفی طرز عمل
کی صراحت کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ جب کوئی رسول ان کے پاس ایسے احکامات
لے کر آتے جسے ان کے نفوس پسند نہیں کرتے تو وہ انبیاء کو جھٹلاتے اور قتل کرتے رہے تاہم
یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ جزئیات سے قطع نظر تمام انبیاء کی تعلیمات کا مرکز و محور بہر
حال ایک ہی رہا ہے یعنی اللہ کی وحدانیت کا اقرار اور اس کے احکامات کی تعمیل۔ دوسری
طرف یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھی جانی لازمی ہے کہ اللہ کے احکامات کی اطاعت سے انکار
صرف بنی اسرائیل تک محدود نہیں یہ رحمان تمام بنی نوع انسانی کے نفوس میں یکساں
ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات بہ حیثیت مجموعی انسانوں کے آج کی قربانی مانگتے ہیں جس کے
عوض بہترین کل کی ضمانت دیتے ہیں لیکن مفاد عاجلہ کے خوگر انسان کے لیے یہ سودا مہنگا
ثابت ہوتا ہے وہ ہر قیمت پر اپنا آج بہتر کرنا چاہتا ہے۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی وجہ

سے نفس امارہ اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی پر راضی ہو جاتا ہے تاکہ صرف اور صرف آج کو حاصل کیا جاسکے۔ دورِ حاضر میں لوگوں کی سوچ کا محور انہی شیطانی خیالوں کو بنا دیا گیا ہے کہ صرف اور صرف آج کی فکر کرو کل کس نے دیکھی ہے جو صرف اور صرف ایک شیطانی فکر ہے جبکہ اسلام کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ وہ طویل المیعاد مفاد کی خاطر فوری مفاد کی قربانی چاہتا ہے۔ جبکہ یہ صورتحال نفس امارہ کو قبول نہیں جو فوری مفاد کا طالب ہوتا ہے لہذا اپنی اس ہوس کی تکمیل کے لیے وہ احکامات الہی سے فرار حاصل کرتا ہے۔

۷۔ نفس (امارہ) دنیا کا طالب ہوتا ہے:

نفس امارہ جیسا کہ عرض کیا گیا فوری مفاد کا خوگر ہوتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ دنیا کی محبت یا اس کی طلب میں شدت کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو زیادہ سے زیادہ مال و دولت جمع کرنے پر اکساتا ہے اور نہ صرف جمع کرنے پر اکساتا ہے بلکہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے۔

يَوْمَ يُحْنِي عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَيَكْوَىٰ بِهَا
جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَذَا مَا كُنْتُمْ
لَا تَفْسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنُزُونَ ۝

(۹/۳۵)

جس دن وہ (مال) جہنم کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ وہی ہے جو تم نے اپنے نفوس کے لیے جمع کیا تھا سو جو تم کرتے تھے (اب) اسکا مزہ چکھو۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ انسانی نفس انسان کو دنیاوی مال و دولت کی ہوس پر اُکساتا ہے اور انسان اس کی اُکساہٹ میں آکر دنیاوی مفادات کا اسیر ہوتا چلا جاتا ہے اور اس حد تک آگے چلا جاتا ہے کہ پھر دین نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور صرف دنیا کی طلب ہی باقی رہ جاتی ہے جس کا انجام اس آیت میں بہت واضح طور پر بتا دیا گیا ہے۔

متذکرہ بلا طریقے وہ ہیں جو از روئے قرآن انسان کا نفس (امارہ) اس کی تباہی کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اب یہ انسان کا اپنا اختیار ہے کہ وہ کونسی راہ اختیار کرتا ہے وہ جیسی راہ منتخب کرے گا ویسی ہی تقدیر اس پر منطبق ہو جائے گی۔

باب ۷

نفس کا احیاء اور نفس کے لیے منفعت بخش افعال

نفس کا احیا

گذشتہ صفحات میں ان تین افعال بد کا تذکرہ کیا جا چکا ہے جن کے نتیجے میں انسانی نفس کی موت واقع ہو جاتی ہے تاہم خود از روئے قرآن یہ موت ابدی نہیں ہوتی اور نفس میں حیات نو کے امکانات موجود رہتے ہیں۔ تاہم یہ یاد رہے کہ یہ حیات نو صرف رزق حلال کے حصول سے ممکن ہے۔ سورۃ الجاثیہ میں ارشاد خداوندی ہے۔

وَإِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ

مِنْ رِّزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ

تَصْرِيفِ الرِّيْحِ آيَةٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ○

(۲۵/۵)

اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے جانے میں اور جو اللہ نے آسمان سے رزق نازل فرمایا پھر اس سے زمین کو اس کے مر جانے کے بعد زندہ کیا اس میں اور ہواؤں کے بدلنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

اس آیت میں منجملہ تین (۳) امور کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیاں (آیات) قرار دیا ہے۔ اول رات اور دن کے آگے پیچھے آنے جانے میں، دوم اس پانی کو جسے "زمین کا رزق" قرار دیا گیا ہے اور جس سے مردہ زمین کو زندگی مل جاتی ہے اور سوم ہواؤں کے بدلنے میں۔ ان تینوں آیات میں سے فی الوقت موضوع بحث کے اعتبار سے دوسری نشانی کو زیر بحث لایا جا رہا ہے۔

یہ ہمارا ایک عام مشاہدہ ہے کہ ایک ایسی زمین جو مردہ ہو، اور اس سے کوئی زرعی پیداوار حاصل نہ ہوتی ہو لیکن اگر اسی مردہ یا بنجر زمین کو مناسب مقدار میں پانی فراہم کر دیا جائے تو وہی مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے اور پیداوار دینے لگتی ہے۔ اس ایک سادہ اور عام فہم مثال کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے زندگی کی اہم ترین حقیقت انسانوں تک پہنچا دی ہے۔

اس آیت پر اگر تدبر کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے پانی کو زمین کا رزق قرار دیا ہے جس سے وہ مردہ حالت سے زندہ حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے بالفاظ دیگر رزق پر نفس کی موت و حیات کا انحصار ہوتا ہے۔ جب رزق سے زمین مردہ حالت سے زندہ حالت میں تبدیل ہو سکتی ہے تو یہ کلیہ یقیناً انسانوں پر بھی لاگو ہوتا ہے کیونکہ رزق کا تعلق زمین کے مقابلے میں انسانوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ رزق پر زمین کی موت و حیات کی طرح انسانی نفس کی موت و حیات کا بھی انحصار ہوتا ہے۔ باطل ذرائع سے حاصل کیا جانے والا رزق نفس انسانی کے موت پر منتج ہوتا ہے (۴/۲۹)۔ لیکن اس موت کے بعد بھی مردہ زمین کی طرح اس میں حیاتِ نو کے امکانات موجود ہوتے ہیں اور یہ حیاتِ نو رزق کی ہی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ تاہم یہ رزق صرف رزقِ حلال ہونا چاہیے اور رزقِ حلال سے مراد وہی رزق ہے جسکا مطالبہ قرآن کرتا ہے یعنی صرف اور صرف ذاتی محنت سے حاصل شدہ رزق۔

قرآن مجید کی اس آیت (۲۵/۵) کی اس مثال پر اگر غور کیا جائے تو بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک سادہ اور عام سی حقیقت کا بیان ہے کہ مردہ زمین کو پانی دیا جائے تو وہ زندہ ہو جاتی ہے اور پیداوار دینے لگتی ہے۔ لیکن اس آیت میں قرآن مجید نے پانی کو ”زمین کا رزق“ قرار

دے کر علوم کی ایک نئی دنیا آباد کر دی ہے۔ مقام تدبیر یہ ہے کہ اس آیت میں اگر لفظ ”رزق“ کا استعمال نہ بھی کیا جاتا تو بھی مفہوم قطعی واضح تھا لیکن اس لفظ ”رزق“ کا اس آیت میں استعمال زندگی کی ایک بنیادی حقیقت کی نقاب کشائی کے لیے کیا گیا ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ رزق اور نفس کی حیات کا آپس میں نہایت گہرا اور براہ راست تعلق ہے۔ انسان، جسم کا رزق حاصل کرتا ہے اور وہ اس کے نفس پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ مسلسل حرام رزق ایک مرحلے پر نفس انسانی کو ہلاک کر دیتا ہے جبکہ حلال رزق نفس انسانی کی بقاء، ترقی اور نشوونما کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

وَيَرْزُقُ رَبِّكَ خَيْرًا وَأَبْغَىٰ

(۲۰/۱۳۱)

اور تیرے رب کا رزق سب سے اچھا اور باقی رہنے والا ہے۔

اس آیت میں ارشاد ربانی ہے کہ تیرے رب کا رزق بھئی بر خیر اور باقی رہنے والا ہے۔ اب اگر رزق کی نوعیت پر غور کیا جائے تو ظاہر ہے اس کی بقا کا کوئی تصور نہیں ہے۔ عام کھانے پینے کی اشیاء کی بقا چہ معنی دارو؟ ظاہر ہے اس سے مراد عام اشیاء رزق نہیں ہیں بلکہ انسانی نفس کی بقا ہے جو رزق کی مرھون منت ہوتی ہے بشرطیکہ اسے جائز اور حلال ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ اس صورت میں رزق نفس انسانی کے لیے خیر اور بقا کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جسے قرآن مجید نے مردہ زمین اور پانی کے رزق کی مثال سے واضح کیا ہے۔

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ لِنَاسٍ لِّمَّا يَعْقِلُونَ

(۲۹/۲۳)

إِلَّا الْعَالَمُونَ

اللہ مثالوں کے ذریعے بات واضح کرتا ہے جسے صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔

متذکرہ بالا آیت (۲۵/۵) پر اگر مزید تدبر کیا جائے تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ وقت کہ کسی بھی لمحے جس وقت انسان چاہے اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔ اگر ماضی میں وہ حرام اور باطل ذرائع سے رزق یا دیگر اعمال بد سے اپنے نفس کو ہلاک کر چکا ہے تو حلال ذرائع سے رزق کی تقدیر منتخب کرنے سے وہ صورت حال مکمل تبدیل کر سکتا ہے۔ جس طرح مردہ زمین کے دوبارہ زندہ ہونے کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں ایسا کسی بھی وقت ہو سکتا ہے بعینہ صورت حال نفس انسانی کے لیے بھی ہے۔ اس حوالے سے سورۃ النساء کی متذکرہ بالا آیت (۴/۲۹) پر مزید تدبر کیا جائے جس میں باطل ذرائع رزق کے نتیجے میں نفس کی ہلاکت کا تذکرہ کیا گیا ہے تو اسی آیت کے بالکل آخری الفاظ میں اللہ نے اپنی رحمت کا تذکرہ بھی کیا ہے اب اگر ان دونوں آیات یعنی (۴/۲۹) اور (۲۵/۵) پر بیک وقت تدبر کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ باطل ذرائع رزق سے نفس کی موت کے بعد بھی اس کے احیاء کا امکان رہتا ہے کیونکہ اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ انسان کسی بھی لمحے حلال ذرائع رزق کی تقدیر اختیار کر کے اپنے نفس کو حیات نو بخش سکتا ہے۔

استغفار سے بحالیء نفس:

از روئے قرآن ایسے لوگ جنہوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہوا نہیں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے ایسے لوگ جو اپنے نفوس پر ظلم کر بیٹھے ہوں انہیں صرف

اللہ ہی سے رجوع کرنا چاہئے۔

قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا
وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝

(۷/۲۳)

انہوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم نے اپنے نفوس پر ظلم کیا ہے اور اگر تو ہمیں
نہیں بخشنے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو
جائیں گے۔

یہ آیت کریمہ واضح طور پر اس امر کی شاہد ہے کہ ایسے لوگ جو اپنے نفوس پر ظلم کر بیٹھے
ہوں اگر وہ اس پر نادم ہوں تو اللہ ہی کی ذات وہ واحد ذات ہے جس سے رجوع کیا جا
سکتا ہے اور وہی اپنے رحم سے نفس کے اس نقصان کی تلافی کر سکتا ہے اور اگر انسان ایسا
نہیں کرتا تو وہ خاسرین میں سے ہو جائے گا۔ لہذا اس حوالے سے اللہ کی ذات سے رجوع
کرنا لازمی ہے اور اللہ یقیناً توبہ قبول کرنے والا، معاف کرنے والا اور اپنی مخلوقات پر بے
انتہا مہربان ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ
وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ
وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا ۝

(۴/۶۴)

ہم نے ہر رسول کو صرف اس لیے بھیجا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی اطاعت
کی جائے اور اگر یہ لوگ جنہوں نے اپنے نفوس پر ظلم کیا تھا تیرے پاس آجاتے
اور اللہ سے استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو یقیناً یہ
لوگ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ ایسے لوگ جنہوں نے ظلم کیا اور نفوس کو خسارے میں ڈالا اگر استغفار کرتے تو اللہ کو یقیناً تو اب اور رحیم پاتے۔ اللہ ان کے نفس کے عدم توازن کو ختم کر کے ان کے نفس کے خسارے کا خاتمہ کر دیتا تا کہ یہ نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کر سکتے۔ استغفار کا مادہ غ ف رہے اس کے بنیادی معنی چھپانے اور محفوظ رکھنے کے ہیں اسی سے مغفرت کے معنی حفاظت کے آتے ہیں، استغفار کے معنی مغفرت طلب کرنا ہیں یعنی اپنے قول و عمل سے کسی باعثِ فساد امر کی اصلاح کی خواہش، اس کے مضر اثرات سے حفاظت چاہنا۔ اس حوالے سے قرآن مجید سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک واقعے کی مثال دی جا سکتی ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک قطبی کو بچانے کے لیے اپنی دشمن قوم کے ایک شخص کو مکہ مارا جس سے وہ مر گیا تو اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ فعل اغوائے شیطان سے ہوا۔

قَالَ هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ (۲۸/۱۵)

(حضرت موسیٰ علیہ السلام نے) کہا یہ فعل تو اغوائے شیطان سے ہوا بے شک وہ انسان کا دشمن اور صریح بہکانے والا ہے۔

تاہم انہوں نے اپنے اس فعل پر اللہ سے استغفار کیا اور اللہ نے ان کو بخش دیا۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ ۗ

(۲۸/۱۶)

إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ

کہا کہ میرے رب میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو مجھے بخش دے تو اللہ نے ان کو بخش دیا بے شک وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہر انسانی عمل کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور پیدا کرتا ہے۔ اچھے اعمال کے نتائج خوشگوار اور برے افعال مضر اثرات پیدا کرتے ہیں۔ اگر ایک فرد غلط روش اختیار کرے تو اس کے منفی اثرات مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں اب یہ ان افعال بد کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے کہ ان کے اثرات کتنے دور رس اور کتنے تباہ کن ہوتے ہیں تاہم اس سے قبل کہ ان منفی اثرات کے نتیجے میں ہلاکت یقینی ہو جائے، اللہ کا قانون مشیت فرد کو ایک موقع ضرور فراہم کرتا ہے کہ وہ راہ راست پر واپس آجائے اگر وہ اپنے افعال بد کے ہلاکت آفرین نتائج کے وقوع سے قبل اللہ سے رجوع کر لے اور اعمال صالح کی تقدیر اختیار کر لے تو اسے استغفار کہا جاتا ہے یعنی ایک طرف اپنے گذشتہ اعمال بد کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ کی پناہ طلب کرنا اور اچھے اعمال کے خوشگوار نتائج کی توقع بلکہ ان کا مشیت ایزدی کے قانون کے مطابق بتدریج سامنے آتے چلے جانا۔

لہذا ایسے لوگ جو اپنے نفوس پر ظلم کر بیٹھے ہوں ان کے لیے تمام راہیں بند نہیں ہو جاتیں اللہ غفور اور رحیم ہے جس لمحے انسان میں یہ احساس جاگ جائے کہ اس کا طرز عمل غلط رہا ہے اور وہ اب رجوع کرنا چاہتا ہے اسی لمحے اللہ سے رجوع کرنا چاہیے وہ یقیناً بار بار توبہ قبول کرنے والا مہربان اور رحیم ہے۔

تاہم ایسے لوگ جو رجوع نہیں کرتے اور حسب سابق اپنی غلط روش پر مصر رہتے ہیں وہ قرآن کی اصطلاح میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے ہیں جیسا کہ متذکرہ بالا آیت (۷/۲۳) سے واضح ہے کہ اگر اللہ ایسے لوگوں پر رحم نہ کرے تو وہ خاسرین میں سے ہو جائیں گے۔ اللہ یقیناً اسی وقت رحم کرے گا جب انہیں خود اس سے رجوع کرے لیکن

اگر انسان خود ہی رجوع نہ کرے تو اسکا انجام سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔
 خسارہ کا مادہ خس رہے جس کی معنی اس شخص کے ہیں جو راستہ سے گم ہو گیا ہو یا ہلاک
 ہو گیا ہو، اس کے علاوہ نقص یا کمی یا بگاڑ اور نقصان جسمیں مال و دولت، عقل اور ایمان، صحت
 و عزت کا نقصان شامل ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ان کا انجام بہر حال ہر
 قسم کا خسارہ ہوتا ہے یہ اصول قرآنی ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔

وہ افعال جو نفس کے لیے منفعت بخش ہیں:

قرآن مجید فرقان حمید میں باقاعدہ واضح طور پر ان افعال کو بیان کیا ہے جو نفس کے لیے
 تقویت کا باعث ہیں ان میں انفاق، ہدایت قبول کرنا، شکران نعمت اور استغفار شامل
 ہیں۔ ان افعال کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ انفاق نفس کے لیے بہتر ہے:

انفاق کا مادہ نفاق ہے۔ انفاق کے معنی ہیں اپنے مال و دولت کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھنا
 قرآن مجید نے امساک (دوک رکھنے) کا لفظ اس کے مقابل لاکر اس معنی مزید واضح کر
 دیے ہیں۔

قُلْ لَوْ أَنْتُمْ تَبْلُغُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّي إِذًا لَأَمْسَكْتُمْ
 نَفْسِيَةَ الْإِنْفَاقِ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَنُورًا ۝ (۱۷/۱۰۰)

کہہ دو کہ اگر میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے تو تم خرچ
 ہو جانے کے خوف سے (ان کو) روک رکھتے اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔

انفاق کا حکم قرآن مجید کے اساسی احکامات میں سے ایک ہے اور جو بھی مال زائد از ضرورت

ہوا سے اللہ کی راہ میں کھلا رکھنے کا حکم ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۗ قُلِ الْعَفْوَ

(۲/۲۱۹)

یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کتنا دے دیں کہہ دیجئے جو ضرورت سے زائد ہو۔

اللہ کے نزدیک انسانوں کا یہ فعل اتنا پسندیدہ ہے کہ اس نے اسے خود کو قرض دینے کے مترادف قرار دیا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعَّهُ

لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۗ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ

وَالِيَهُ تُرْجَعُونَ ۝

(۲/۲۴۵)

کوئی ہے کہ اللہ کو قرض حسد دے کہ وہ اس کے بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا۔

انفاق کے قرآن مجید میں متعدد فوائد گنوائے گئے ہیں مثلاً انفاق کی شکل میں جو رقم اللہ کی راہ

میں دی جاتی ہے کم از کم اس رقم کی واپسی کی ضمانت خود قرآن مجید دی گئی ہے

(۲/۲۷۲)؛ بعض مقامات پر دو گنی رقم کی واپسی کا کہا گیا ہے (۵۷/۱۱) اور ایک مقام پر

سات سو گنا سے بھی زائد کی واپسی کی ضمانت دی گئی ہے (۲/۲۶۱)؛ قرآن اسے ایک ایسی

تجارت کے مثل قرار دیتا ہے جو کبھی تباہ نہیں ہوگی (۳۵/۲۹)؛ اس کے نتیجے میں انسان کو

معزز رزق حاصل ہوتا ہے، روز قیامت مدارج بڑھتے ہیں اور بخشش ہو سکتی ہے (۸/۳)؛

یہ اللہ کی قربت اور رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے (۹/۹۹)؛ اس کے بدلے اللہ تعالیٰ اعلیٰ،

معزز اور بزرگ تر بدلے کا وعدہ کرتا ہے (۹/۱۲۱) (۵۷/۱۱) (۷۳/۳۰)؛ اس کے نتیجے

میں انسان بہتر نتائج حاصل کرتا ہے (۳۳/۳۹)، یہ انسان کو خوف و حزن سے محفوظ رکھتا ہے (۲/۲۶۲)، یہ کامل نیکی کے حصول کی راہ ہے (۳/۹۲)، اس سے زندگی کی ناہمواریاں دور ہوتی ہیں (۵/۱۲)، اللہ کی رضا کے حصول اور بامراد ہونے کے لئے یہ لازمی ہے (۳۰/۳۸)، اس سے راہ آسان ہو جاتی ہے (۷-۵/۹۲)، عاقبت کے بہترین گھر کا حصول اس سے ممکن ہے۔ (۱۳/۲۲)، دردناک عذاب سے بچنے کے لئے یہ لازمی ہے (۱۱-۱۰/۶۱)، اجتماعی بقا کا انحصار اسی پر ہے (۲۷/۳۸) ان تمام فوائد کیساتھ انفاق انسانی نفس کے لئے بھی بہتر ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ
 يَشَاءُ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُفْسِدُكُمْ ۚ وَمَا
 تَنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ
 خَيْرٍ يُوَفِّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ۝

(۲/۲۷۲)

اے رسول! انہیں راہ پر لانا تیرا کام نہیں اور جو چاہے (اللہ کے قانون مشیت کے مطابق) سیدھی راہ کا انتخاب کر لے اور جو مال بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تمہارے نفوس کے لئے ہی خیر کا سبب ہوگا اور جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا اہم مل جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اسی طرح سورۃ التغابن میں فرمان الہی ہے:-

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَأَسْمِعُوا وَأَطِيعُوا
 وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِّأَنْفُسِكُمْ ۚ وَمَنْ يُوقِ شُحَّ
 نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

(۶۴/۱۶)

پس اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو اور اپنے مال اس کی راہ میں خرچ کرتے رہو یہ تمہارے نفوس کے لئے خیر کا سبب ہوگا اور جو لوگ دل کے بخل سے بچائے جاتے ہیں وہی فلاح پانے والے ہیں۔

توجہ طلب امر یہ ہے کہ متذکرہ بالا دونوں آیات کریمہ (۲/۲۷۲) اور (۶۳/۱۶) میں انفاق کے عمل کو انسانی نفس کے لئے باعث خیر قرار دیا گیا ہے۔ خیر کا لفظ متعدد معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان معنوں میں شرف، برتری، فضیلت و کرم بھی شامل ہیں۔ اس حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انفاق کے ذریعے نفس کو دیگر نفوس کے مقابلے میں شرف و برتری حاصل ہو جاتی ہے یا فضیلت و ترجیح حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں خیر کا لفظ ادنیٰ کے مقابلے میں بہتر (۲/۱۰۶)، ضرر کے مقابل (۶/۱۷)، فتنہ کے مقابل (۲۲/۱۱)، شر کے مقابل (۲/۲۱۶)، ہر اچھی بات یا اچھے عمل کے لئے (۱۶/۷۶)، دنیا اور آخرت میں ہر قسم کی خوشگوار یوں اور خوشحالیوں کے لئے (۱۶/۳۰) میں آیا ہے۔ ان معنوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ انفاق کے نتیجے میں نفس کو نہ صرف یہ کہ دیگر نفوس کے مقابلے میں سبقت حاصل ہو جاتی ہے بلکہ وہ دنیا اور آخرت کی تمام خوشگواریاں بھی حاصل کر لیتا ہے۔

۲۔ ہدایت سے نفس کو فائدہ ہوتا ہے

نفس کی نشوونما اور ترقی کا پہلا اور آخری راستہ راہ حق ہے صرف اس راہ کو اختیار کر کے ہی نفس کو ہدایت حاصل ہو سکتی ہے ایسی ہدایت جو اسے کامیابی کی راہ پر لے جاتی ہے۔ اس سے ہدایت کا ماخذ قرآن مجید فرقان حمید ہے۔ صرف قرآن کی راہ ہی راہ ہدایت ہے کیونکہ خود قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ ہدایت صرف وحی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ

بے شک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے۔

(۲/۱۲۰)

اس آیت کریمہ سے واضح طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہدایت صرف وہی ہے جو اللہ نے اپنے بندے اور آخری رسول (ﷺ) پر وحی کی جو قرآن مجید کی شکل میں تاقیامت محفوظ ہے۔ اور قرآن مجید ہی کی بتائی ہوئی راہ سے نفوس کو ہدایت مل سکتی ہے اس کے علاوہ نہیں۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ
فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ، وَمَنْ ضَلَّ
فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا، وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ

(۱۰/۱۰۸)

کہہ دو کہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس حق آچکا ہے تو جو کوئی ہدایت حاصل کرتا ہے تو اس ہدایت سے اپنے نفس کا بھلا کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو گمراہی سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور میں تمہارا وکیل نہیں ہوں۔

یہاں واضح طور پر قرآن مجید کو حق قرار دیا گیا ہے اور اسے ہی متبع ہدایت قرار دیا گیا ہے قرآن مجید کے علاوہ کسی ذریعہ ہدایت کا کوئی تذکرہ پورے قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے صرف قرآن ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے ہدایت حاصل ہو سکتی ہے۔

ہدایت کا مادہ ہدی ہے جس کے بنیادی معنی ہیں نمایاں، روشن ہونا، آگے ہونے کے ہیں تاہم اس کے معنی میں ہدیہ اور تحفہ بھی شامل ہیں۔ اس کے معنی میں رہ نمائی کرنا واضح کرنا بھی شامل ہیں۔ ہدایت صرف اور صرف اللہ کی جانب سے ممکن ہے۔

إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ

(۲/۱۲۰)

بے شک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے۔

اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محض ضلالت اور خسارہ ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الضَّلٰةَ بِالْهُدَىٰ فَبِأَرْبَحَتْ
تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝

(۲/۱۶)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی تو نہ تو ان کی تجارت نے
ہی کچھ نفع دیا اور نہ انہیں ہدایت نصیب ہوئی۔

یہی واحد راہ ہے جو راہ مستقیم ہے کیونکہ سیدھی راہ صرف اللہ دکھا سکتا ہے اور کوئی نہیں صرف
اس راہ کا انجام کامیابی اور نعمتوں کا حصول ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝ مَلِكِ
يَوْمِ الدِّينِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝

(۱/۱ - ۴)

ہم تیری ہی اطاعت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں ہمیں سیدھی راہ دکھا
ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا۔

یہ راہ ایک خود اختیار کردہ راہ ہوتی ہے جو لوگ اس راہ کو اختیار کرنا چاہیں وہ اپنے نفوس کو
بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو اس راہ پر نہ چلنا چاہیں ضلالت اور گمراہی ان کا مقدر
بن جاتی ہے۔ جو لوگ اس راہ پر چلنے کے خواہش مند ہوں انہیں متقین کہا جاتا ہے اور قرآن
انہی لوگوں کے لئے شمع ہدایت ہے۔

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى
لِّلْمُتَّقِينَ ۝

(۲/۲)

اس کتاب (قرآن مجید) میں کوئی شک نہیں یہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے رہنمائی ہے۔

جو چاہے اس کتاب سے رہنمائی لے لے اور جو چاہے انکار کر دے اگر ہدایت حاصل کی جاتی ہے تو اس کا مثبت اثر انسانی نفس پر ہوگا اور اگر انکار کر کے گمراہی خریدی جائے تو اس کا منفی اثر نفس پر ہوگا یہ سیدھا سادا بنیادی کلیہ ہے۔

مَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ، وَمَنْ ضَلَّ
فَأِنَّمَا يَضِلُّ عَنْهَا وَلَا تُزْرُ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ

(۱۷/۱۵)

جو شخص ہدایت کی راہ اختیار کرتا ہے تو اپنے نفس کے لئے کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے اس کا ضرر بھی اسی کو ہوگا اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا مطلب ان منجملہ تمام اصول و ضوابط و احکام کی پابندی ہے جن کا مطالبہ قرآن انسانوں سے کرتا ہے۔ ان احکام کی کلیتاً پابندی سے ہی نفوس کو ہدایت مل سکتی ہے اور دنیاوی اور اخروی نعمتوں کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں۔ اس حقیقت کا اعادہ (۲۷/۹۲) اور (۳۹/۴۱) میں بھی کیا گیا ہے۔

۳۔ شکر سے بھی نفس کو فائدہ پہنچتا ہے

از روئے قرآن نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے بھی نفس کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي
غَنِيٌّ كَرِيمٌ ۝

(۲۷/۴۰)

اور جو شکر ادا کرتا ہے تو اپنے نفس کے لئے شکر ادا کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے
تو میرا رب غنی اور کرم کرنے والا ہے۔

اس حقیقت کا اعادہ سورۃ لقمان میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ ۖ وَمَنْ يَشْكُرْ
فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَبِيدٌ ۝

(۳۱/۱۲)

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی کہ اللہ کا شکر ادا کرو اور جو شخص شکر کرتا ہے تو اپنے ہی
نفس کے لئے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز اور سزاوار حمد ہے۔

۲۔ پاکیزگی اختیار کرنا

سورۃ الفاطر میں ارشاد خداوندی ہے

وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۖ

(۳۵/۱۸)

جو تزکیہ کرتا ہے وہ اپنے نفس کے لئے تزکیہ کرتا ہے۔

اس آیت میں استعمال کیے جانے والے لفظ تزکی کا مادہ زک و ہے جس کے معنی پھلنا، پھولنا،
نشوونما پانا، نپک اور برگزیدہ ہونا، آسودہ حال اور صاف ستھرا ہونا اور پاکیزہ ہونا ہیں۔ اس
کے معنی خیر و خوبی کے ساتھ بڑھنے، بالیدگی اور ارتقاء کے بھی ہیں۔ سورۃ الشمس میں زکھٹا
کے مقابلے میں دسھا کا لفظ آیا ہے۔ (۱۰-۹/۹۱) دسھا کے معنی ہیں کسی کی نشوونما اور بالیدگی

کو روک دینا، دبا دینا اس کے برخلاف زکھا کے معنی ہوں گے نشوونما، بالیدگی، ترقی دینا۔ اس بنیاد پر تزکیہ نفس سے مراد نفس کو شرک اور فواحش کی آلودگیوں سے پاک کر کے اسے نشوونما اور ترقی دینا۔ جو شخص بھی اپنے نفس کا تزکیہ کرتا ہے اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ کسی قسم کا ظلم نہ کرے اور ان تمام افعال بد سے دور رہے جن کی ممانعت قرآن کریم میں کی گئی ہے صرف اسی صورت میں اس کا نفس پاک ہو سکتا ہے۔

اقوام کے نفس اجتماعی کی حیات و موت ✓

جس طرح انفرادی سطح پر افراد کے نفوس کی حیات و موت کا تعین ان کے ذرائع رزق سے ہوتا ہے اسی طرح اجتماعی طور پر بھی اقوام کی موت و حیات کا انحصار ان کے اجتماعی نفس کی حیات و موت پر ہوتا ہے اور اجتماعی نفس کی موت و حیات کا انحصار پھر ان ذرائع رزق اور نعمتوں کے استعمال کے طریقے پر ہوتا ہے جو اس قوم کو اللہ تعالیٰ کی جانب عطا کی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے بنیادی اصول یہ ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ

(۱۳/۱۱)

اللہ کسی قوم کی حالت تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود اپنے نفوس میں تبدیلی نہ

لائے۔

گویا اس حوالے سے سیدھا سادا قانون یہ ہے کہ وہ افراد جن پر اقوام مشتمل ہوتی ہیں وہ پہلے اپنے نفوس کو تبدیل کریں گے یعنی اپنے نفوس کی اصلاح کریں گے تو اللہ ان کی حالت تبدیل کرے گا یہاں اللہ کے تبدیل کرنے سے مراد اس کے وہ قوانین ہیں جو قوم کی اس اختیار شدہ تقدیر کے حوالے سے خود بخود منطبق ہو جائیں گے اور قوم کو قعر معذلت سے اٹھ

کر اوج ثریا پر لے جائیں گے لیکن شرط یہی ہے کہ پہلے قوم کے افراد خود اپنے نفوس کی فکر کریں، اس کی اصلاح کریں اور حیاتِ نو کا سامان کریں باقی کام خود بخود اللہ کے متعین کردہ قوانین کی مدد سے ہوتا چلا جائے گا۔

جہاں تک اقوام کا تعلق ہے ظاہر ہے وہ افراد سے مل کر بنتی ہیں جو کلیہ افراد کے نفس کی حیات و موت کے لئے ہے وہی اقوام کے لئے بھی ہے۔ وہ تمام افعال جن سے نفس کو حیات ملتی ہے بالخصوص حصول رزقِ حلال، وہ افعال جن سے نفس کو تقویت ملتی ہے مثلاً انفاق، ہدایت کی قبولیابی، شکرانِ نعمت اور استغفار وغیرہ اقوام جب ان افعال کی راہ پر چل پڑتی ہیں تو ان کے نفوس خود بخود تبدیل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور قومیں بلند یوں کی راہ پر چلنا شروع ہو جاتی ہیں اور اگر وہ ایسا نہیں کرتیں اور برعکس صورت میں ان افعال پر کار بند رہتی ہیں جن سے نفس کو ضعف پہنچتا ہو تو ظاہر ہے ان کا ٹھکانہ قعرِ معدلت ہی ہوتا ہے۔ لہذا قوموں کے عروج و زوال کا یہ سادہ سا قانون ہے جو قوم بھی اس پر عمل کرے گی وہ عروج حاصل کر لے گی جو اسے نظر انداز کرے گی وہ خس و خاشاک ہو جائے گی۔

اس حوالے سے یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ جب کسی قوم کو اس طرح سے کوئی نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو اللہ اپنی مشیت سے طے شدہ قانون کے تحت اس قوم سے وہ نعمت بھی واپس نہیں لیتا تا وقتیکہ وہ قوم پھر اپنے نفوس میں تبدیلی پیدا کر کے خود ہی اپنے آپ کو اس نعمت کے لئے نااہل قرار نہ دے لے۔

ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا لِنِعْمَتِهِ أَنْعَبَهَا عَلَى قَوْمٍ
حَتَّى يُغَيِّرُوا أَمَايَا نَفْسِهِمْ، وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

(۸/۵۳)

اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو کوئی نعمت دیتا ہے تو اس نعمت کو اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ وہ قوم اپنے نفوس کو تبدیل نہ کرے اور اللہ یقیناً بہت سننے والا اور جاننے والا ہے۔

جہاں تک نعمت کا تعلق ہے یہ عربی کا وسیع المعانی لفظ ہے اس سے مراد مسرت، مال و دولت، آسودگی و خوشحالی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو کسی بھی نوعیت کی کسی بھی نعمت سے سرفراز کرتا ہے تو اپنی مشیت سے طے شدہ قانون کے مطابق اس نعمت کو اس قوم سے اس وقت تک واپس نہیں لیتا جب تک وہ قوم خود اس نعمت کی اہل نہ رہے۔ کوئی قوم نعمتوں کی اہل اس وقت نہیں رہتی جب ان کے نفوس مردہ ہونا شروع ہو جائیں اور نفوس بخل، افعال بد، اللہ کی قائم کردہ حدود کو توڑنے اور اللہ کی نافرمانی سے ضعف کا شکار ہوتے ہیں اور باطل کمائی سے مکمل ہلاک ہو جاتے ہیں۔ لہذا جب کوئی قوم ان افعال کی راہ پر چل نکلے تو اس کے نفوس مردہ ہو جاتے ہیں اور جو نعمت اس قوم کو اللہ نے دی ہوتی ہے وہ اس سے چھین لی جاتی ہے کیونکہ ظاہر ہے نعمتیں زندہ لوگوں کو دی جاتی ہیں مردوں کو نہیں۔ مردے کسی نعمت کے حقدار نہیں ہوتے۔ تاہم اگر وہ قوم پھر اپنے نفوس کو تبدیل کرنے تو پھر وہ نعمتوں کی حقدار ہو جاتی ہے۔

اس کی سادہ سی مثال سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کی مثال سے دی ہے۔

وَصَدَّبَ اللَّهُ مَثَلًا قُرْبِيَّةً كَانَتْ أَمْنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا
رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ
فَإِذَا قُضِيَ إِلَيْهَا لِبَاسُ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَ
هُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ۝

(۱۱۳-۱۱۴/۱۶)

اور اللہ ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ ہر طرح آسمن و چین سے تھی ہر طرف
سے رزق با فراغت چلا آتا تھا مگر ان لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو
اللہ نے انہیں ان کے اعمال کے سبب بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔ اور ان
کے پاس خود انہی میں سے ایک پیغمبر آیا تو انہوں نے اس کو جھٹلایا سو ان کو عذاب
نے آپکڑا اور وہ ظالم تھے۔

ان آیات میں ایک توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ ان آیات مبارکہ میں کسی خاص مسلم، عیسائی،
یہودی بستی کا تذکرہ نہیں ہے۔ ایک عمومی صورت حال ہے لہذا ان آیات سے جو نتائج
مستنبط ہوں گے وہ عمومی نوعیت کے ہوں گے اور کسی بھی بستی / قوم پر قابل اطلاق ہوں
گے۔ ان آیات کی رو سے یہ ایک ایسی بستی تھی جو ہر طرف سے مطمئن و خوش تھی رزق با افراط
و ستیاب تھا لیکن اس بستی کے رہنے والوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی بالفاظ دیگر وہ
تمام افعال انجام دینا شروع کر دیئے جن سے ان کے نفس کمزور سے کمزور تر اور بالخصوص
ہلاکت پر پہنچ گئے نتیجے کے طور پر کلی تباہی ان کا مقدر بن گئی۔ تاہم یہ سب کچھ خود ان کے
اپنے افعال کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے ظلم کیا اور نتیجتاً برباد ہو گئے۔ لہذا نفوس کی بربادی اجتماعی
تباہی کے مترادف ہے اسی وجہ سے متذکرہ بالا آیات سے بالکل متصل اگلی آیت میں

مسلمانوں کو اس طرز عمل سے اجتناب برتنے، اللہ کی اطاعت اور شکر گزاری کے لئے کہا گیا ہے تاکہ ان کے نفوس برباد نہ ہوں اور وہ اس بستی جیسی تباہی سے دوچار نہ ہوں۔

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاشْكُرُوا

(۱۶/۱۱۳)

نِعْمَتِ اللَّهِ إِنَّ كُنْتُمْ لِرِيبَاءَ تَعْبُدُونَ ۚ

پس اللہ نے جو تم کو حلال طیب رزق دیا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو اور اسی کی اطاعت کرو۔

اس آیت کریمہ میں واضح طور پر اللہ کی نعمتوں کے شکر ان اور اللہ کے قوانین کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ مسلمان تباہی سے محفوظ رہیں۔

مجموعی طور پر اس بحث کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ نفس (امارہ) اور شیطان مل کر انسان کو گمراہ کرتے ہیں لیکن اگر انسان خود بہکنا نہ چاہے تو ان کے حربے با آسانی ناکام بنا سکتا ہے۔ تاہم اگر فطری کمزوریوں کی وجہ سے کوئی لغزش ہو جاتی ہے یا مسلسل اعمال بد سے نوبت نفس کی ہلاکت تک جا پہنچتی ہے تو بھی نفس کی حیات نو کے دروازے اللہ نے بند نہیں کیئے وہ غفور و رحیم ہے، وہ بار بار رحم کرنے والا ہے۔ مختلف اعمال صالح جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے ان سے نفس کی حیات نو کے امکانات ہمیشہ موجود رہتے ہیں اور یہ کلیہ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر یکساں ہے۔

قاری حافظ محمد زمان قادری رضوی

منظوم مشاعر و کلامات عربیہ و فارسیہ

کراچی، پاکستان

پتہ
بکھیں بلنگ فلیٹ نمبر ۱
شہرہ دیکھت کراچی

قاری حافظ محمد زمان قادری



تصدیق نامہ
میں قاری حافظ محمد زمان قادری رضوی نے قرآن کا قصود کی پروفیزنگ
کی ہے اسلامک بک سنٹر کراچی میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ اغلاط
سے پاک ہے۔
دانشاؤ اللہ

مصنف کی شائع شدہ کتابیں

رزق کی برکت و کھانکے قرآنی قوانین

پروفیسر ڈاکٹر فاروق عزیز



ارتقاء حیات از روئے قرآن

پروفیسر ڈاکٹر فاروق عزیز



مصنف کی وہ کتابیں جو انشاء اللہ جلد زیور طبع سے آراستہ ہونے والی ہیں

چند مخصوص قرآنی اصطلاحات

قوموں کے عروج و زوال کے

قیامت از روئے قرآن

297.07

ف 19 ق

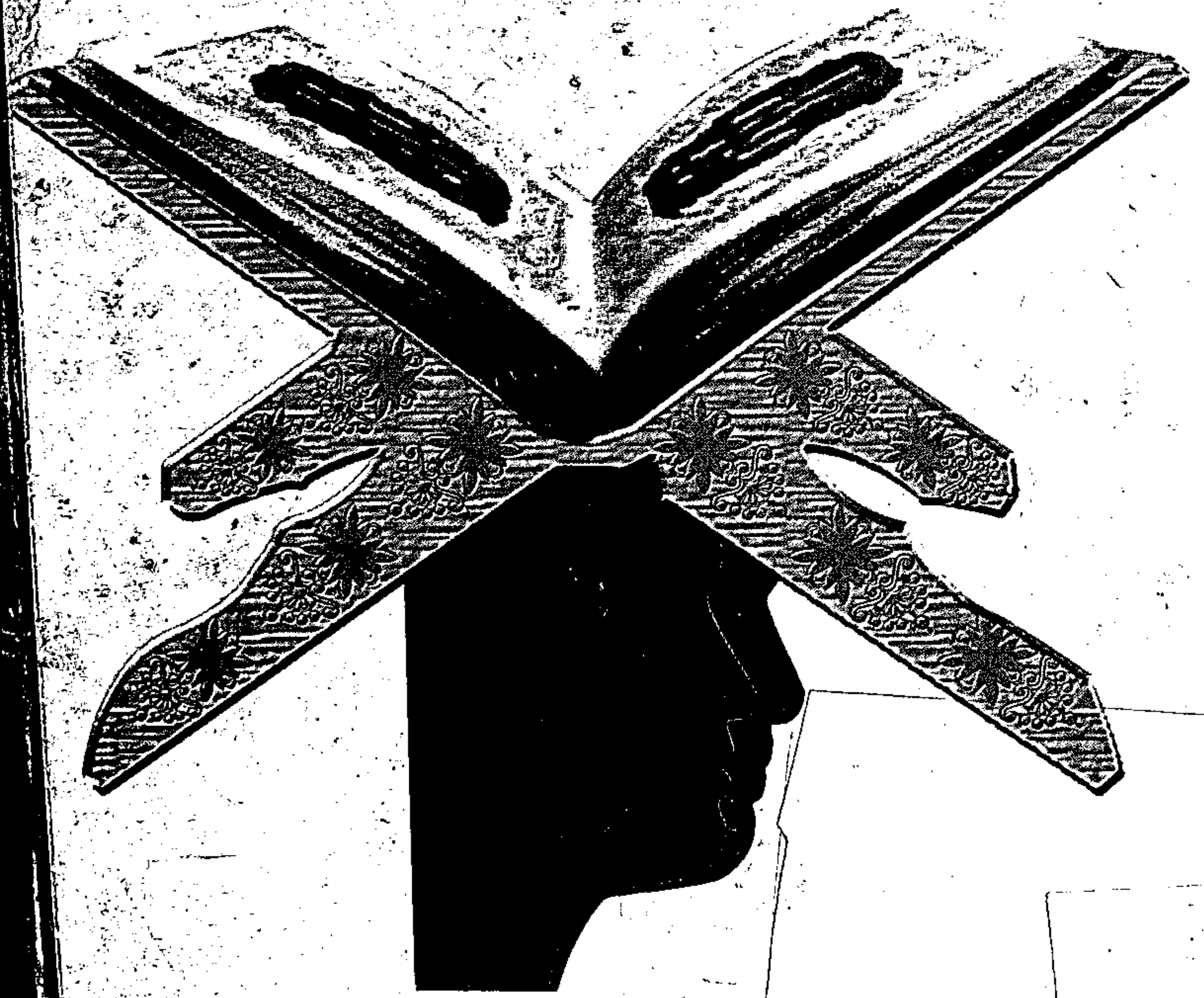


7 2 7 2 4 - U - 6 7 *

اسلامک بک سینٹر

مقدس مسجد اردو بازار کراچی - فون: 2726970

قرآن کا تصویب



پروفیسر ڈاکٹر فاروق عزیز